خصوصی شمارہ
Tanazur
Est. 1977, R.No. 40608/83
تناظُر
شمارہ
38-39
عصری ادب، آرٹ اور کلچر کا باشعور ترجمان
مدیران: بلراج ورما، سیماب سلطان پوری، قمر جمالی

اُردو اینتھالوجی

عصری ادب، آرٹ اور ثقافت کا باشعور ترجمان

فکشن نمبر

مدیران : بلراج ورما، سیماب سلطان پوری، قمر جمالی

اِنتظامیہ : مُکتی ورما

پبلشرز

تناظر پبلی کیشنز

24 ڈی، پاکٹ 3، میور وِہار، فیز 1، دہلی 110091

فون 22718482

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دار جریدہ

مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ یہ اینتھالوجی علمی، ادبی، سماجی و سیاسی یعنی ہر قسم کی جماعتی سیاسیات سے پاک ہے۔

اِشاعت: جولائی تا دسمبر 2004

خصوصی شمار : (38-39)

کمپوزنگ : محمد اسلام خان 9868357106

طباعت : ناہید پریس، لال کنواں

قیمت : 120 روپے

بیرون ممالک : امریکی ڈالر 10، برطانوی پاؤنڈ 5

خط و کتابت اور مضامین بھیجنے کے پتے

۱ : تناظر پبلی کیشنز، 24 ڈی، پاکٹ 3، میور وِہار فیز 1، دہلی-110091

۲ : سیماب سلطان پوری، جنرل سکریٹری حلقۂ تشنگانِ ادب
22 سی/اے I بی، پشچم وِہار، نئی دہلی-110063

۳ : قمر جمالی، راحت کدہ، ہاؤس نمبر 21-4، پلاٹ نمبر 14، ہیما گری نگر کالونی، گندھم گدہ، حیدر آباد-500008 (آندھرا پردیش)

۴ : ترسیل زر کا پتہ: منیجر تناظر پبلی کیشنز، دہلی-110091

تفصیل وترتیب

باب تمثیلات:

باب افکار عالیہ:

ہندوستانی زبان ___ افسانہ۔ کہانی

افسانہ (کہانی) دنیائے ادب کی غالباً سب سے مقبول صنف ہے۔ کہانی (افسانہ) لکھنا جتنا آسان ہے اچھا افسانہ لکھنا اتنا ہی مشکل۔ افسانہ مغربی فکشن کے ترجموں کے وسیلے سے حاصل کیا ہوا مانا جاتا ہے۔ اگرچہ سنسکرت، پالی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں فکشن مغربی اقتدار کی آمد سے پہلے بھی رائج تھا۔ فکشن میں بڑا اور اہم ترین کینوس ماضی کی داستانوں اور حال کے ناول میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ناول اور افسانے میں فرق صرف طول اور اختصار کا نہیں۔ دونوں میں فن اور مفہوم کے علاوہ ایک واضح تکنیکی فرق بھی ہے۔ ناول پوری زندگی کا بھرپور کینوس ہوتا ہے جب کہ افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو پر مرکوز ہوتا ہے اور اس کی اساس افسانہ نگار (کہانی کار) کو اپنے کسی شعوری یا لاشعوری تجربے یا کسی معمولی حادثے یا واقعے پر رکھنی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کسی خاص کردار سے اس کی مختصر سی ملاقات (Brief Encounter) بھی کہانی (افسانہ) کی تعمیر و تشکیل کا موجب بن جاتی ہے۔ افسانے میں واقعات، کردار اور مناظر بھی محدود ہوتے ہیں۔ البتہ فنون لطیفہ (Performing Arts) اور ادب کی دوسری اصناف کی طرح اس کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی تناظر وہی ہوتے ہیں جن سے ناول نگار، شاعر، مصوّر یا سنگ تراش پریرنا (Inspiration) لیتا ہے۔

یوں تو کسی سلجھے ہوئے اخبار نویس کی آنکھوں دیکھی، کانوں سنی یا من گھڑت رپورٹ بھی کہانی (افسانے) کے زمرے میں ہی آتی ہے مگر وہ افسانہ (کہانی)، کم از کم ادب کی زبان میں افسانہ (کہانی) یعنی رچنا نہیں کہلاتا۔ افسانے (کہانی) کا سب سے اہم عنصر جذبہ ہوتا ہے، جذبہ جو تخلیق کار کے ذہن کی اندرونی تہوں میں کوئی واحد خیال یا قسم قسم کے خیالات و جذبات کا تانا بانا بن کر، کبھی دھیرے دھیرے تو کبھی ایک دم اچھل کر

اُبھرتا ہے اوراپنی پوری شبیہ کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوجاتا ہے کسی بے جان چیز کی طرح نہیں بلکہ ایک زندہ دھڑکتے دل کی طرح۔ افسانے (کہانی) میں روح کی مہک اور دل کی دھڑکن سنائی نہ دے تو اُسے کچھ بھی کہہ لیجیے مگر افسانہ نہ کہیے کیوں کہ یہ مہک اور دھڑکن ہی افسانے (کہانی) کے زندہ یا ذی جان ہونے کا ثبوت ہے۔ کامیاب افسانے (کہانی) کا خالق ہی نہیں اس کا قاری بھی تخلیق کار ہی کی طرح اس خیال یا جذبے یا احساس سے دوچار ہوتا ہے جس سے تحریک پاکر کوئی رچنا عمل میں آتی ہے جس طرح ایک (Performing Artist) ایکٹر، موسیقار یا رقاص، سامعین کی خوشنودی کے بغیر کامیاب نہیں کہلاتا، عین اسی طرح اگر افسانہ نگار (کہانی کار) قارئین کو اوّل تا آخر باندھ کرنہیں رکھ سکتا تو اپنی رچنا کی کامیابی پر ایمان لے آنے کا حق دار نہیں۔ کہانی ہو یا غزل، تصویر ہو یا مجسمہ اپنی اصلی شناخت اور اپنے مقام کے تعین کے لیے خالق اور مخلوق کے دائمی رشتے کے مرہونِ منت رہتے ہیں اور اس رشتے کی بقا کے لیے دونوں کے مابین سہل اور ہموار آمدورفت ضروری ہے۔

کچھ عناصر یا اجزائے ترکیبی جو افسانے (کہانی) کے لیے ضروری ہیں، وہ ہیں (۱) پلاٹ (۲) کردار نگاری (۳) نقطۂ نظر یعنی مقصد (۴) منظر یا پس منظر (۵) تکنیک یا اسلوب (۶) مواد یعنی موضوع اور (۷) سلیقہ یعنی فن۔ پلاٹ واقعہ یا واقعات کی فنی تنظیم کے لیے ضروری ہے تا کہ فن کا مرکزی خیال اِدھر اُدھر بھٹکے بغیر کہانی کو اس کے نقطۂ عروج یعنی منزلِ مقصود تک پہنچادے۔ اسی کے برعکس کردار نگاری کہانی کے مقصد اور اسے آگے بڑھانے کا ایک ذریعہ محض ہوتی ہے۔ البتہ یہ بھی سچ ہے کہ ایک کامیاب کہانی کبھی محض پلاٹ کے سہارے تو کبھی محض کردار نگاری کے سہارے بھی پنپ سکتی ہے۔ جیسے غلام عباس کی ''آنندی'' اور منٹو کی ''ہتک'' یا ''بابو گوپی ناتھ''۔

نقطۂ نظر یعنی کہانی کا مرکزی خیال یا مقصد ہی وہ تحریک ہے جس سے کہانی کے کہانی پن اور کرداروں کی تشکیل ہوتی ہے۔ نقطۂ نظر دراصل فن کار کا نظریۂ حیات یعنی اس کے تجربات اور جذبات کا مرکب ہوتا ہے، لہٰذا اس کا تعلق اس کی شخصیت اور اس کے فکروفن

سے براہِ راست رہتا ہے۔

یہ ادب اور آرٹ کی ہر صنف کے لیے ضروری ہے۔ نقطۂ نظر کا شعوری ہونا ضروری نہیں، کبھی کبھی اس کا منبع تخلیق کار کا لاشعور یا تحت الشعور بھی ہوتا ہے۔ مثال ہے آسکر وائلڈ (Oscar Wild) کا ناول پکچر آف دی ڈورین گرے۔(Picture of the Doriangray)۔ ناول کے چھپ جانے پر جب وائلڈ کے اُستاد والٹر پیٹر نے اسے بتایا کہ ناول ایک سماجی بلکہ روحانی درس دیتا ہے تو وائلڈ ایک دم چونک اُٹھا کیوں کہ اس ناول کی تخلیق کے دوران اس نے کبھی بھول کر بھی نہ سوچا تھا کہ اس کا مقصد اپنے قارئین کے اعمال سدھارنا ہے۔ وہ ادب برائے ادب کا قائل تھا۔

کہانی کا پس منظر یعنی تناظر یعنی فضا یا ماحول کہانی کا ایسا اہم اور ضروری پہلو ہوتا ہے جس کے بغیر نہ پلاٹ میں جان پڑتی ہے نہ کردار نگاری میں۔ پس منظر کا تانا بانا بیانیہ کا سہارا لیے بغیر چند ایک تیکھے اور نوکیلے اشاروں اور کنایوں سے بھی مرتب ہوسکتا ہے۔ ضرورت صرف اس چیز کی ہے کہ وہ پلاٹ، کردار (کرداروں) اور نقطۂ نظر سے اتنا ہم آہنگ ضرور ہو کہ کہانی میں وہ وحدت اور تاثر پیدا ہو جائے جس کے بغیر کہانی تخلیق (Creative Litreture) کے زمرے میں نہیں آتی۔ کسی روزنامچہ کی خبر بن کر رہ جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے اور درست کہا جاتا ہے کہ ہر کہانی کی اپنی ایک الگ تکنیک ہوتی ہے جس کا تعین کہانی خود کرتی ہے اُسے کیسے لکھنا چاہیے کہ وہ اپنے پورے جلال کے ساتھ اجاگر ہو۔ یہ کہانی کار سے بھی زیادہ کہانی کے عناصر یعنی نقطۂ نظر، پلاٹ، کردار یا تناظر مشترکہ طور پر متفقہ رائے سے طے کرتے ہیں۔

ہوتا یوں ہے کہ رچنا کار کے ذہن کی تینوں قوتیں یعنی شعور، لاشعور اور تحت الشعور برابر شامل ہو کر اس صلاحیت کو جنم دیتی ہیں جو کہانی کے تمام اجزا میں ایک تناسب، ترتیب اور سلیقہ پیدا کرتی ہے۔ یہ صلاحیت یہ سلیقہ ہی تکنیک یا فن کہلاتی ہے۔

تناظر کا ایک ہی موقف ہے۔ ''ادب برئے زندگی'' باقی نعرے بازی ہم نظرانداز کر سکتے ہیں مگر اس نعرے سے جو ابدی، ازلی اور سرمدی سچائیوں کا حامل ہے ہم نظر نہیں

چرا سکتے۔ زندگی دیہات کی ہو، کسی چھوٹے بڑے قصبے کی ہو یا کسی بڑے میٹرو پولٹین شہر کی۔ اس کے تہذیبی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل تقریباً ایک سے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کے لباس، زبان و بیان یا روزمرہ کے طور طریقوں میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ اضطراب اور ہیجان، حسرتیں، مایوسیاں اور ناکامیاں کسانوں یا مزدوروں ہی کا مقدر نہیں، یہ متوسط اور اونچے طبقوں سے تعلق رکھنے والے شہریوں کی زندگیوں کا بھی اہم حصہ ہوتی ہیں۔

بہ الفاظ دیگر مواد یعنی موضوعات زندگی کے ہر نکڑ، ہر موڑ اور راستے پر بکھرتے ملتے ہیں۔ آج کے کہانی کار کو سحر انگیز فضاؤں میں بھٹکنے کی ضرورت نہیں، اس کے چاروں طرف کہانیوں کے انبار لگے ہیں، خود اس کی اپنی زندگی کبھی نہ ختم ہونے والی کہانیوں کا ایک سلسلہ ہے جس میں سے وہ ہزار زندگیاں بھی چنے تو خزانہ ختم نہ ہو۔ اسے کارزار زندگی میں شریک ہوکر آدمی کو اس بے معنی کشاکش سے مکتی دلاتا ہے جس سے تھک کر، ہار کر وہ اکثر معصوم کبوتر کی طرح آنکھیں موند لیتا ہے، اسے زندگی کو سنوارنے، شکوک اور توہمات سے نجات دلانے کا عزم لے کر قلم اٹھانا اور اپنے اندر اس جوہر، لگن، روشنی اور آگ کو پیدا کرنا ہے جس کی تپش سے مٹی بھی کندن بن جاتی ہے۔ اسے ہیئت اور مواد میں توازن لانا ہے اور ادب کو ''کاروباریت'' کا شکار ہونے سے بچانا ہے۔ ادب ذہنی خوش حالی اور ترقی کا ذریعہ اور زینہ ہے، یہ سماجی زندگی کا ترجمان ہی نہیں اسے بدلنے اور سنوارنے کا ہتھیار بھی ہے۔ ادب کا مواد جاندار اور ارتقاء پذیر ہونا چاہیے تاکہ حسن کاری پر ادیب کی دست رس بڑھے اور وہ اپنے خیال اور اظہار میں وہ شدتِ احساس، دِلوں کو چھو لینے والی وہ قوتِ بیان اور سماج کو آگے لے جانے کی وہ مقصدیت پیدا کر سکے جو فن اور فنکار کا سب سے اہم بلکہ مرکزی تقاضا ہے۔ فن اور موضوع (مواد) میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب میں تخلیقی اوصاف بے حد ضروری ہیں ورنہ ادب اور صحافت کی حد بندیاں ٹوٹ جائیں گی اور ہم ادبی کہانی اور نیوز اسٹوری کے اہم فرق کو بھول جائیں گے۔

مقصد سامنے ہو تو فن کار کے ذہن میں اپنے آپ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ کیا، کیوں اور کس لیے کہنا چاہتا ہے۔ اس طرح بات کہنے میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے، مگر مقصدیت

کے ساتھ قدرتِ کلام بھی ضروری ہے۔ اپنی بات کو اس کے بغیر خوش رنگ اور پر اثر بنانا ناممکن ہے۔ زبان خیال کو ظاہر کرنے کا وسیلہ ہے اگر خیال میں خامی ہو تو بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ لیکن اگر ڈھیلے غور و فکر کے ساتھ پیرایۂ اظہار بھی ناقص ہو تو بات بنتی ہی نہیں۔

لفظ اور معنی دونوں اہم ہیں، دونوں ہم آہنگ ہو جائیں تو ان میں مکمل مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔

لفظ اپنے آپ میں ایک بڑی قوت ہے، اس کے صحیح اور برمحل استعمال کے بغیر بیان ناقص ادھورا اور بے جان ہو جاتا ہے اور خیال اور احساس بھی مجروح ہو جاتے ہیں۔ لفظ ادب کی زبان اور خیال اس کا باطن ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لازم ملزوم ہیں، ان کے میل ملاپ سے ہی اسلوبِ بیان بنتا ہے۔ خیال کا پُر اثر اظہار الفاظ کے صحیح انتخاب کے بغیر قطعی ممکن نہیں۔ دراصل ہر خیال کی ادائیگی کے لیے الفاظ اور ان کی ترتیب پہلے ہی سے مقرر ہوتی ہے خیالات سوچ سے ابھرتے اور الفاظ علم سے حاصل ہوتے ہیں جب تک فن کار کی رسائی دونوں تک یکساں نہ ہو وہ اپنی سوچ کے دھاروں یعنی خیالات اور احساسات کو دوسروں تک پہنچانے میں قاصر رہتا ہے اور اس کا پیرایۂ اظہار واضح اور دل نشیں نہیں ہوتا۔

زبان اظہار کا وسیلہ ہے۔ ہم اپنی بات اسی لیے تو کہتے ہیں کہ سننے والا سنے، سمجھے اور محظوظ ہو۔ ہماری زبان سادہ، سلیس اور دل نشیں ہوگی تو ہماری بات سننے والوں کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ عوامی یعنی عام رابطے کی عام رائج زبان پے چیدہ طویل اور بھاری بھرکم جملوں یا غیر فطری حکیمانہ باتوں سے کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے۔

ایک اچھی کہانی ایک ہنرمند کاری گر کی سوجھ بوجھ اور خوب سوچ سمجھ کر بُنے ہوئے غالیچے کی طرح ہوتی ہے جس کی ایک جامع شبیہ ہوتی ہے اور ایک مجموعی تاثر ہوتا ہے۔ کہانی میں رنگ برنگے پیوندوں کی طرح جڑے ہوئے جملوں (فقرے بازی) کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے مگر وہ کہانی کا انگ ہوتے ہوئے بھی کہانی نہیں ہوتے۔ ان کو ایک آوارہ شعر یا پُر لطف گفتگو کی طرح سن کر لمحہ بھر کے لیے محظوظ تو ہوا جا سکتا ہے مگر وہ دیرپا لطف حاصل نہیں ہوتا جو پورے فن پارے کو محسوس اور سمجھ کر کے ملتا ہے۔ یعنی جس سے قاری کا ذہن منور

ہوتا ہے اوردل مسرور۔ کہانی میں دلوں کو موہ لینے والی شیریں کلامی تو ہونی ہی چاہیے۔ کہانی شاعری بھی ہے اور موسیقی بھی، مصوری بھی ہے اور مجسمہ تراشی بھی۔

اس دورِ جمہوریت میں بادشاہوں، امیروں، جاگیرداروں یا نجی لٹیروں کے غیر فطری قصیدے اور مرثیے ہماری تخلیقات کا مواد نہیں بن سکتے کیوں کہ ہمارا عصری ادب تفننِ طبع کا وسیلہ یا وقت گزاری کا ذریعہ نہیں۔

ادب زندگی کو سدھارنے، مہکانے، حسین اور بہتر سے بہتر بنانے کا ایک معتبر آلہ ہے۔ البتہ نامور، نیک سیرت، ہمدرد، مرنجاں مرنج اور عام مگر وضع دار لوگ جو صاحب ثروت بھی ہو سکتے ہیں اور غریب و بے حیثیت افراد بھی۔ ہماری کہانیوں کے کردار ہوں گے تو ان کی جانی پہچانی صورتیں اور سیرتیں ہماری کہانی کا شرنگار بن جائیں گی۔ فن کار ایک عام آدمی کی نسبت انسانی فطرت کا بہتر نباض ہوتا ہے لہٰذا اسے اپنے سماج اور اپنے معاشرے کے خلاف یا حق میں سوالات اٹھانے کا حق ہے۔ فن کار، آرٹسٹ ہے۔ پیغمبر و ولی یا مسیحا نہیں۔ سوالوں کے حل یا جوابات مہیا کرنا اس کا کام نہیں۔ یہ قاری کا کام ہے، کیونکہ قاری ہی وہ نقاد، وہ پارکھ ہے جو ادب کا مقام متعین کرتا ہے۔ قاری تک اپنے دل کی بات پہنچا سکنا بلکہ اسے محظوظ، متاثر اور خوش کرنا ہی وہ کلید ہے جو فن کار پر شہرت کے کواڑ کھولتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ خود اس کی اپنی ذات اور اس کے آس پاس بکھری زندگی ہے جو ہموار کم اور کھردری زیادہ ہے۔ اگر فن کار اس رخشندہ حقیقت کو سمجھنے کا اہل نہیں تو اس کی تحریر محض بے کار اور تضیع اوقات ہی رہے گی۔

کہانی میں غیر ضروری تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں سے دل کشی پیدا کرنے کی کوشش ہمیشہ رائیگاں جاتی ہے۔ اسی طرح محض رنگینیٔ بیان اور عبارت آرائی سے بھی بات نہیں بنتی۔ راجندر سنگھ بیدی کو ایک اچھے شعر اور ایک اچھے افسانے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا اور وہ ہر کامیاب کہانی کو دلوں کو چھو لینے والے اشعار یا گدگدانے والی موسیقی کے طور پر ہی لیتے تھے باوجودیکہ ایک عظیم فن کار کے ناطے جانتے تھے کہ شعر اور نثر کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ان میں جو فرق ہے وہ نمایاں ہے۔ جس طرح بے جا تکلف اور تصنع، بے لطف مضمون آفرینی اور شاعرانہ پینترے، شعری لطافت کو مجروح کر دیتے ہیں اسی طرح بلند اور پُر زور

انشا پردازی بھی کہانی کے لیے مضر ہے۔ اسے ہم کو موسیقی کے نام پر اٹھائی گئی اس چیخ پکار کے طور پر لینا ہوگا جس کے شوروغل میں دب کر فن کاری اپنا اصلی مفہوم ہی نہیں بلکہ اپنا تاثر بھی کھو بیٹھتی ہے۔ تصنع اور تکلف کہانی کے تانے بانے کو الجھا کر بدرنگ اور مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں اور وہ کچھ اس طرح بے رنگ و بو اور گنجلک ہو جاتی ہے کہ قاری کوشش کے باوجود اس کی روح کی شناخت یا اس سے لطف اندوز ہونا تو درکنار اسے چھو یا ایک نظر دیکھ بھی نہیں پاتا۔

پورا عالمی منظر نامہ گواہ ہے کہ مقبولیت یعنی (Popular Acceptance) انھیں فن کاروں کے حصے میں آتی ہے جو اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو آسان، شگفتہ اور دل کش زبان میں ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جان بوجھ کر مشکل زبان وہی لکھتے ہیں جو آسان زبان آسانی سے لکھ نہیں سکتے یا جنھیں اپنی قابلیت کا سکہ جمانا مقصود ہوتا ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ علم وادب کی اپنی اپنی حد بندیاں ہوتی ہیں اور اگرچہ علمی مضامین اور مباحث میں تو مشکل الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال کسی حد تک غیر فطری نہیں ہوتا مگر کہانی میں ان کی قطعاً کوئی ضرورت یا گنجائش نہیں ہوتی۔ سادگی اور پُر کاری اور سلاست ایک بڑا فن ہے مگر سلاست کے ساتھ کہانی میں لطفِ بیان اور تاثر بھی ہونا چاہیے، یہ اسی صورت ممکن ہوتا ہے جب ادیب صاحبِ علم ہو اور اسے زبان پر پوری قدرت اور موضوع پر گہری گرفت حاصل ہو۔ یہ لوازمات ہر باکمال فن کار کی شخصیت میں پہلے ہی سے خاص مقدار میں موجود (Built in) رہتے ہیں تا کہ وہ اپنے جذبات کی پرتیں ایک ایک کر کے اپنے مخصوص ومرغوب طرزِ بیان سے واشگاف (Reveal) کرتا جائے۔ اس کے شعور میں قاری کی ضروریات یا اس کی ذہنی حدوں (Intellectu al Limitations) کا بھلے ہی کوئی واضح اندازہ نہ ہو اس کا لاشعور اپنے قاری کو پہچانتا ہے اور شعور کو کچھ ایسے باندھے رکھتا ہے کہ رچنا کاری اپنے آپ قابل فہم اور دل کش ہوتی چلی جاتی ہے۔ فن کار اور قاری کے مابین آمد ورفت کی قوس قزح ایک مضبوط اور ہموار پُل کی طرح بنی رہنی چاہیے تا کہ دورانِ مطالعہ اِدھر اُدھر جھانکے بغیر قاری اس پُل سے گزر جائے، یعنی کہانی کے مفہوم کو نہ صرف سمجھے، اس کے اثر کو بھی قبول کرے بلکہ اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو۔ جو کہانی

قاری کو جکڑ کر نہیں رکھ سکتی اور ایک ہی نشست میں اس کی اپنی چیز نہیں ہو جاتی وہ خام اور کمزور ہے۔ اگر ہم قاری ہیں تو ہمیں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے اختراعات کو بھلا کر صرف افسانویت اور افسانہ گوئی کو ہی نگاہ میں رکھنا چاہیے تاکہ ہم تخلیق کو دیکھ کر،، سن کر، سونگھ کر پہچان سکیں۔ اپنا سکیں۔

ژاں پال سارتر تخلیق کو زندگی کا بہترین روپ کہتے ہیں۔

ایک اور اہم بات: ہم میں سے اکثر اردو اور ہندی کو دو الگ الگ بھاشائیں (زبانیں) مانتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جدا جدا نہیں ایک ہی زبان (یعنی ہندوستانی) کے دو رُخ ہیں۔ دونوں کی ماں کھڑی بولی مانی جاتی ہے۔ یعنی دونوں کا جنم، الفاظ اور گرامر ایک ہے۔

ہندی نے سنسکرت اور اُردو نے فارسی سے اپنا رنگ روپ اور لباس چنا تھا جو وقت کی سیاسی ضرورت تھی۔ دونوں کا لہجہ، طرزِ کلام اور سُر لہری ہی ایک جیسی نہیں، اپنے اپنے وجدان کے اعتبار سے بھی جڑواں بہنیں لگتی ہیں۔ ہم دونوں زبانوں کو سمجھتے اور اُن میں بات چیت کر سکتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی تعبیر اور تفسیر کو سمجھنے سمجھانے کی لیے ہمیں کسی ترجمان کی ضرورت نہیں۔ یہ اتنی سہل اور ہمارے اتنی قریب ہیں کہ اپنے آپ دلوں میں اتر جاتی ہیں۔ برادر جوگندر پال جیسے دانش ور فارسی رسم الخط ہی کو اُردو زبان اور اُردو کی کھال کہتے ہیں جو ایک دم غلط تو شاید نہیں مگر بھول جاتے ہیں کہ کھال پورا بدن نہیں ہوتی، بدن میں دِل ہوتا ہے۔ رُوح (آتما) ہوتی ہے جو بدن کے سب سے اہم اور ضروری اجزاء (انش) ہیں۔

ہمارے راشٹر پتی مہاتما گاندھی اور راشٹر پتی ڈاکٹر ذاکر حسین نے دونوں زبانوں (اردو اور ہندی) کو ہندوستانی بھاشا (زبان) کا نام دیا تھا۔ جو سادہ، سہل روشن اور صاف شفاف کئیت ہے۔ دونوں ہر قسم کی ادبی سیاست سے بلند تر، بلند قامت، آزاد خیال و بلند نظر بزرگ تھے۔ ہمیں بھی ہندوستانی کو اردو اور ہندی کا سنگم سمجھنا چاہیے۔

جابر حسین، پیغام آفاقی، غضنفر اور صلاح الدین پرویز جیسے آزاد خیال، کشادہ ذہن والے ادیبوں نے اِس فرق کو سمجھ لیا ہے۔ اس شمارہ کی دو کہانیاں غضنفر کی ''دو یہ بانی'' اور راقم الحروف کی ''نِشا نمنترن'' خاصی پُر اثر مثالیں ہیں۔

امرتا پریتم سے انٹرویو

مکتی ورما

ساہتیہ اکادمی اور بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈیافتہ پدم وبھوشن محترمہ امرتا پریتم صاحبہ کا جنم پاکستان کے ضلع گجرانوالہ میں ۳۱ راگست ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ ان کی تعلیم لاہور (پاکستان) میں ہوئی۔ ان کے والد برج بھاشا کے شاعر تھے۔ امرتا جی اپنے والد محترم ہی کا عکس کہی جاسکتی ہیں۔

فرانس، روس، جرمنی، بلگیریہ، رومانیہ یوگوسلابیہ، چیوکوسلواکیہ، ہنگری، نیپال اور مارشیش جیسے دور دراز ممالک نے ان کے شاعرانہ وقار کو دل وجان سے سراہا اور اپنی اپنی زبانوں میں ان کے کلام کو شائع بھی کیا۔

مئی ۱۹۸۶ء میں آپ راجیہ سبھا میں بطورِ ممبر چنی گئیں۔ ان کی تخلیقات ۹۵ کتابوں پر مشتمل ہیں، ان میں نظمیں، کہانیاں، ناول اور مضامین سب شامل ہیں۔ وہ ہندوستانی ادب کی اُن روشن ترین شخصیات میں سے ہیں جن پر ہم بجاطور پر ناز کرسکتے ہیں۔ وہ ہمارے دور کی ایک ایسی سچی اور بارسوخ فنکارہ ہیں جسے ہم بلا جھجک اپنی نوجوان نسل کا سنگ میل کہہ سکتے ہیں۔ ان پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہوگا۔

ان کے ناول ''دھرتی، ساگر اور سیپیاں'' اور کہانی ''زندگی'' پر ٹی وی سیریل ''کادمبنی'' اور ''ڈاکو'' کے علاوہ تیسرے ناول ''پنجر'' پر ۲۰۰۴ء میں ایک کامیاب فلم بنی۔ زی ٹی وی نے پنجر کی کہانی اور گیتوں کے لیے امرتا جی کو سالِ رواں کی بہترین شاعرہ اور ادیبہ قرار دیتے ہوئے انعام سے نوازا۔

کارِ جہاں کے اپنے اس لمبے سفر پر چلتے چلتے امرتا جی آج ۸۵ سال کی ہوگئی ہیں اور اب اپنی طویل علالت سے عاجز آکر معالج سے بھی تقریباً مایوس سی دکھائی دینے لگی ہیں۔ مگر ان کی پرتیبھا کی سوگندھ آج بھی ویسی ہی مہکتی مہکاتی ہے جس کے ہم گذشتہ چھ

سات دہوں سے عادی ہو چکے ہیں۔

ہم خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتے ہیں کہ وہ جلد از جلد ان کی صحت اور کامرانی لوٹا دے تاکہ ہم ان کی روشنی اور مہک میں ہمیشہ کی طرح خوش اور مسرور رہیں۔

انٹرویو

مکتی : زندگی میں سب سے اہم چیز کیا ہے؟

امرتا جی: زندگی میں سب سے اہم چیز ہے مسرت، خوش الحانی اور مہکتی مہکاتی تندرستی—— یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر وہ شادابی اور شادمانی بکھر گئی جو ہمیشہ ہی سے ان کا خاصا رہی ہے۔

امرتا جی نے بتایا کہ 108 دانوں کی مالا کا جاپ جو گھروں میں ہمارے بڑے بزرگ اکثر کرتے ہیں۔ 12 راشیوں اور 9 گرہوں پر مشتمل ہے (12×9=108) یہ گرہیں ہمارے پورے برہمانڈ میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان کا عکس ہم سب پر پڑتا ہے۔ ہماری خوشیاں اور ہمارے غموں یہاں تک کہ ہماری تندرستی اور بیماری وغیرہ پر بھی یہ عناصر اثر انداز ہوتے ہیں۔

مکتی : یہ باتیں میری سمجھ سے ماورا ہیں۔ آپ کی زندگی تو علم و ادب یعنی شاعری، نظم، کہانی اور ادبِ عالیہ کے دیگر مضامین سے تعلق رکھتی ہے پھر یہ گرہ یہ راشیاں (وغیرہ؟) میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں اگر چہ میری دلچسپی بڑھانے کے لیے کم نہیں ہیں۔

امرتا : یہ بات واقعی دلچسپی سے خالی نہیں۔ لیکن مکتی میں جیوتش وڈیا کو ایک مکمل اور حقیقی سائنس مانتی ہوں۔ گرہ نچھتر ہماری زندگی میں بڑے اہم ہیں ان کا سیدھا رشتہ ہماری زندگی سے ہے، جس کا علم اس وڈیا میں جتنا گہرا ہوگا اس کی کلکولیشن (Calculation) اتنی ہی ٹھیک ہوگی۔ البتہ ٹھیک اوقات اور مقامات جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔

مکتی : واہ! آپ نے تو میری جگیاسا اور بڑھادی۔ کیا میں آپ سے اس جیوتشی سائنس کے بارے میں کچھ اور جان سکتی ہوں؟

امرتا جی: دیکھ مکتی۔ میں نے بتایا ہے نا کہ ٹھیک وقت کا علم یعنی جانکاری ہی جیوتش سائنس کا منبع ہے۔تم جاننا چاہتی ہو تو ناگمنی کے شماروں میں چھپی تفصیلات کو غور سے پڑھ لو۔خود بخود سب سمجھ جاؤ گی۔

میں کہوں گی کہ سائنس میں ترقی ضرور ہوئی ہے اور اس نے ایک جادوگر کی طرح ہم سب کی زندگی کے ہر پہلو پر اپنا موٴثر کردار انجام دیا ہے لیکن جب تک یہ سائنس روحانیت سے خالی ہے یہ انسان کو سچی خوشی سے محظوظ نہیں کر سکتی۔ کیا ہیروشیما پر ایٹمی بم گرا کر انسان کو خوشی ملی؟

یورپ اور امریکہ کے سائنس دانوں نے سلفر، آئرن، گولڈ، سلور، تانبہ اور دوسرے دھاتوں کی کھوج کے لیے ایک پنڈولم تیار کیا ہے۔ جو زمین میں پائے جانے والے سونا، چاندی وتانبہ کی کھوج میں مدد کرتا ہے۔اس پنڈولم سے موت کی دوری بھی آنکی گئی جو صرف 40انچ کے فاصلے پر محیط ہے۔مرد اور عورت کا I.Q. 27انچ کی دوری پر برابر برابر پایا گیا۔ پنڈولم کے ذریعے انھیں کچھ ایسے پتھر بھی ملے جس پر موت کا سایہ نمایاں طور پر واضح تھا۔کیوں کہ وہ دشمنوں پر پھینکے گئے تھے۔اس کے بعد ندی کے کنارے والے پتھروں کی جانچ پڑتال کی گئی۔ان پر کوئی سایہ نہیں تھا۔پھر کچھ پتھر پٹخے گئے اور ان پتھروں پر غصہ دِکھنے لگا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے بولنے کا ڈھنگ اسی طرح ہوا میں گردش کرتا ہے جس طرح ہم بولتے ہیں۔ بغاوت بڑھے گی تو نفرت بڑھے گی اس کی ہوا میں پوری Vibration بھی ہوگی۔

مستقبل میں دشمنی جنگ کو جنم دے گی۔ سائنس کا غلط استعمال پورے معاشرے کی تباہی کا باعث ہوسکتا ہے اور ایسا ہوا بھی ہے۔ امریکہ میں ہونے والا 11/9/2001 کا حادثہ عالمی طاقتور ملک کے خلاف بغاوت ہی کی ایک بڑی مثال ہے۔ کاش آنے والی نسل روحانیت کا رکھ رکھاؤ سیکھے اور ہر قدم سوچ اور سنبھل کر مناسب سمت اور رفتار سے طے کرے۔

مکتی : آپ کی رکھ رکھاؤ والی بات سے مجھے یاد آیا کہ کل ایک اجتماع میں اکثر لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ نوجوان نسل آسانی سے جلد از جلد حاصل ہو سکنے والی چیزوں کی طرف ہی متوجہ ہوتی ہے۔ میں چاہوں گی کہ آپ بھی ان کی صحیح رہنمائی کریں۔

امرتا جی: آج کی نوجوان نسلوں کا ذہن تجارت اور سائنس کی طرف زیادہ بڑھ رہا ہے۔ زندگی میں صالح عالمی اقدار کی اہمیت باقی ہی نہیں رہی۔ اہمیت اب صرف جلد از جلد مال جٹا کر ایک دم امیر ہونے کی ہے۔ لوگوں کا یہ نظریہ بن چکا ہے کہ جتنی دولت ہوگی اتنی ہی زیادہ عزت ملے گی۔ اسی لیے لوگ مال جمع کرنے کی خاطر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ سنگ تراش چاقو، چھری اور چھینی سے بت تراشتا ہے لیکن فن کی سچی آگہی نا ہو تو اناڑی پن کی وجہ سے بت بنتے بنتے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اناڑی کی تراشنے اور نوجوان نسل کی افراتفری میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ہماری نوجوان نسل کو اپنے ہاتھ لمبے کرنے چاہئیں تاکہ اس میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی سما سکیں۔ اگر چیزیں بڑی ہوں گی تو چھوٹے ہاتھ کیا کریں گے؟

مکتی : واہ امرتا جی آپ نے تو نوجوان پیڑھی کی ہوس کو سچ مچ تراش دیا۔ کیا آپ کو اپنے بچپن میں کبھی محسوس ہوا تھا کہ آپ اور آپ کی قلم کبھی نا کبھی ان بلندیوں کو جا چومے گی جو پورے فضا کو چمکا اور مہکا دے؟

امرتا جی: بچپن بڑا ہی پیارا اور بھولا دور ہوتا ہے کیا کوئی بچہ ان بلندیوں کے بارے میں کبھی سوچ بھی سکتا ہے؟ نہیں، نہیں۔ زندگی کی اُمید و مسرت کے احساسات وقت کے ساتھ خود بخود سوچنے اور لکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے تو ہاتھ رکتے ہی نہیں۔ آج میں پھر یہ کہنا چاہتی ہوں کہ نوجوان نسل کو طاقت سے، نام سے، دولت سے، ہنر سے اور اپنی ہمت سے اپنے کام سنبھالنے چاہئیں۔ اپنے لمبے ہاتھوں کو چھوٹا نہ ہونے دیں۔ اپنا کردار خود بنائیں اور اپنے دیش کو ترقی پر گامزن کرنے کے لیے مثبت سوچ پیدا کریں کیونکہ واحد کامیابی و ترقی کا صرف

یہی ایک راستہ ہے۔

مکتی : آپ اپنے بچپن کا کوئی ایسا واقعہ بتلائیں گی جس نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہو؟

امرتا : میں بہت چھوٹی تھی اور اپنی ماں کی چارپائی کے پاس بیٹھی رو رہی تھی کیوں کہ میری بیمار ماں آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اتنے میں میری ایک سہیلی چلی آئی اور بولی ''امرتا اُٹھ، خدا بچوں کی دعاؤں کو سنتا ہے۔ جا اپنی ماں کی صحت کے لیے دعا مانگ۔''

میں اٹھی اور نہایت دلجمعی سے خدا کے حضور میں ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے لگی۔ لیکن ماں کا آخری وقت آچکا تھا اس لیے میری دعا کارگر نہیں ہوئی۔ اس حادثے نے میرے من پر ایک اَن مٹ چھاپ چھوڑ گیا۔ کسی کے بھی پوچھنے پر کہ کیا خدا ہے؟ جواب بڑے یقین سے ہوتا تھا کہ ''نہیں'' کیوں کہ ایشور ہوتا تو میری فریاد ضرور سنتا۔

مکتی : کیا خدا کے نہ ہونے کی بچپن کی وہ چھاپ ابھی تک ویسے ہی برقرار ہے؟

امرتا جی: نہیں نہیں۔ وہ ایک بچپنا تھا۔ اور کم عقلی تھی جس کی بنا پر اس قسم کا غلط نظریہ قائم ہونے لگا تھا۔ کوئی بھی بچہ ایسے واقعے کے بعد ایسا ہی سوچے اور محسوس کرے گا جیسا کہ میں نے کیا کیونکہ خدا اور ماں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ زندگی ایک بلبلہ ہے اور دنیا کی کوئی بھی چیز کوئی بھی جذبہ دائمی نہیں ہوتا۔

مکتی : تو کیا آپ اب مانتی ہیں کہ آنے والا مستقبل مقدر صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھوں میں ہے؟

امرتا جی: دیکھو بھئی (تھوڑا مسکراتے ہوئے) اللہ تعالیٰ کوئی واحد ہستی تو ہے نہیں جو بیٹھا سوچتا رہتا ہے کہ کیا کب کرنا ہے اور کیا کب نہیں کرنا۔ The Master is not a person. He is only a presence. آنے والا مستقبل ایک حد تک گذرے ہوئے کل یعنی ماضی پر منحصر ہوتا ہے۔ آدمی کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو اپنے ہاتھ سے بنائے سنوارے کیونکہ گذشتہ کیے ہوئے

اس کے کام اس کے آنے والے مستقبل کو بگاڑنے اور سنوارنے میں اہم ہوتے ہیں۔ ماضی مستقبل کی ایک بہت ہی اہم کڑی ہے۔

مکتی : کام کرنے پر یقین، اس کی اہمیت، زندگی سے جوڑ، سچ مچ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں گیتا کے شلوک سن رہی ہوں۔ گیتا میں بھگوان فرما گئے ہیں: ''تمہارا فرض صرف عمل کرنا ہے۔ پھل کی پرواکرنا نہیں۔ نا کبھی پھل کو اپنا مقصد بناؤ نا اپنے آپ کو ناکارگی کا شکار ہونے دو۔ یقیناً جہد مسلسل ہی سچی کامیابی اور کامرانی ہے۔ صحیح اور سیدھا راستہ ہی زندگی کا مقصد ہونا چاہیے۔ واقعی یہی زندگی جینے کا وہ درس ہے جو تاحشر ہمارا خضر وراہبر ہونا چاہیے۔

میں آج آپ کو بہت زحمت دے رہی ہوں لیکن اس بحرِ بیکراں سے جتنا سیراب ہوسکوں کم ہے۔ ایک چھوٹی سی بات، آپ کو اس مقام تک پہنچانے میں آپ کے خاندان کا کتنا ساتھ حاصل رہا ہے کیا آپ کے خاندان کا ماحول بھی ادبی تھا؟

امرتا : ماں کی وفات کے بعد میں اپنے والد کے اثر ورسوخ سے ہی متاثر رہی۔ وہ اپنے وقت کے ایک اچھے اور سلجھے ہوئے ادیب اور شاعر تھے جو برج بھاشا میں لکھتے تھے۔ ان کا یہ کردار میری ادبی دلچسپی میں سب سے اولین معاون ثابت ہوا۔ یہ ان ہی کے طور طریقے تھے جو ان سے مجھے ملے۔ یہ ان ہی کا ڈالا ہوا بیج تھا جسے میں نے اپنے خون سے سینچا اور اپنی ذات میں جھیلا۔ میرے والد کی ذات، اُن کے احساسات ہی نے میرے جیون کو سجایا اور سنوارا ہے۔ وہ میرے گرو اور مرشد تھے۔

مکتی : لیکن سننے میں آیا ہے کہ آپ کی شادی تو ایسے ادبی ماحول میں نہیں ہوئی تھی؟

امرتا : شادی کے بعد جب مجھے ایسا ماحول نہیں ملا جو میرے ان سنسکاروں کو بڑھاوا دیتے۔ میں نے اپنا ماحول خود بنایا کیونکہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا ضروری تھا۔ محنت، لگن، جنون کو زندہ رکھنے کے لیے جس قسم کی قربانی کی ضرورت تھی میں اسے کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

مکتی : وہ بیج آج، بھرپور شاخوں سے لدا سجا ایک بڑ کا پیڑ بنا میرے سامنے ہے۔ آپ

زندگی کی کن کن دشواریوں سے گزری ہوں گی اِس کا اندازہ میں کرسکتی ہوں، کیوں کہ میں بھی ایک عورت ہوں۔ میں آپ کے حوصلہ، قربانی اور اِدراک کے آگے اپنا سر جھکاتی ہوں۔ آپ جس مقام تک پہنچی ہیں بنا کسی روحانی طاقت کی مدد اور اپنے بزرگوں کی دعاؤں سے سیڑھی در سیڑھی بلاخوف چڑھتے جانا اس دوزخی اور دورنگی دنیا میں آسان نہیں۔ مجھے سمندر کی تہہ سے سچ مچ وہ انمول موتی مل رہے ہیں جن سے کچھ اور کی چاہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اب میرا آخری سوال بھی ضرور پورا کر دیجیے۔ آپ کے ادبی کردار کو نکھارنے میں کون سے پہلو زیادہ اہم ثابت ہوئے ہیں؟

امرتا : لگتا ہے آج میرے امتحان میں کوئی مضمون چھوٹے گا نہیں۔ خیر۔ میں سب سے زیادہ بھارت کی قدیم تاریخ اور اسطور کی زیر بار ہوں۔ اُپنشدوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ بچپن سے ہی میرا من گرنتھوں کو پڑھنے اور سمجھنے میں لگتا تھا۔ صوفی وادمیں کبیر، داؤد، بلّے شاہ سے میں خاصی متاثر رہی۔ ہاں میرے والد کے پاس اور بھی بہت پرانے گرنتھ تھے جن کا پڑھنا ہی میری اصلی تعلیم تھی۔ وارث شاہ کے بول میرے جذبات و احساسات کو بیدار کرنے میں کافی معاون ثابت ہوئے تھے۔ جس کا اثر آج تک ہے اور آگے بھی رہے گا۔ شرت چندر اپنی مثال خود تھے، ایک دم دوسروں سے الگ۔ آج کل میں رجنیش سے متاثر ہوں۔ ہاں اپنے غیر ملکی سفر کے دوران بدیشی شاعروں کی شاعری سے بھی بہت متاثر ہوئی ہوں اور ان کی اجازت سے میں نے ان کی شاعری کا ترجمہ پنجابی اور انگریزی میں کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے بہت مطمئن ہوئی ہوں۔

مکتی : تھوڑا زحمت اور — آپ کی سیاست اور پارلیمانی دَور!!

اُمرتا : اچھا تھا۔ پر سیاسی ٹرم کا پورا ہونا اور بھی اچھا لگا تھا کیونکہ میرے بنیادی خیالات سے اُدھر کوئی متفق نہیں تھا۔ ویدوں کا کہنا ہے کہ ''جڑ کی قدر کرو ورنہ نئے پتے نہیں آئیں گے اور آنے والے نئے پتوں کی بھی قدر کرو۔ لیکن آج جمہوریت

کے نام پر ووٹ یعنی سیاسی طاقت حاصل کرنا ہی ہمارے اکثر سیاست دانوں کا پہلا اور آخری مقصد ہوتا ہے۔

مکتی : کیا آپ کی جوانی کے دَور میں دیش کی حالت ایسے ہی تھی یا کچھ مختلف تھی؟

امرتا : میں نے دیش کی تقسیم ۱۹۴۷ء میں دیکھی ہے البتہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ یہ حالت ختم ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ''پنجر'' پکچر ۱۹۴۷ء تقسیم ہی کی دین ہے۔

مکتی : ''پنجر'' کے گیت، گدّا، ڈائیلاگ، کہانی۔ میں سمجھتی ہوں کہ ۱۹۴۷ء سے جڑی یہ بہت ہی مؤثر اور خوب صورت کہانی ہے۔ اس کہانی پر زی ٹی وی والوں نے آپ کو گیت اور کہانی پر انعام بھی پیش کیا ہے۔

امرتا : (امرتا جی بیماری کی حالت میں بستر میں سمٹی سی) بولیں: میں نے گھر میں ٹی وی پر یہ پکچر دیکھ لی ہے۔ مُکتا کہاں جاتی، کیسے جاتی اور دونوں آنکھیں بند کر کے لیٹ گئیں۔ ان کو ایسی حالت میں دیکھ کر میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی —— مانو میرے سامنے کا بہتا سا گر سمٹ کر خشک ہو گیا اور میرے ہاتھ موتی ٹٹولتے ٹٹولتے کمزور اور بے جان رہ گئے ہوں۔

[بشکریہ اُردو دنیا، نئی دہلی]

رفعت سروش سے گفتگو

مکتی ورما

اردو ادب کی اس اہم شخصیت کا جو ۱۹۴۵ء سے ۱۹۸۴ء تک آل انڈیا ریڈیو سے ایک ناٹک کار، نغمہ نگار، پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور افسانہ نگار کے حوالے سے جڑے رہے اور اپنے کرشموں سے ریڈیو میں اردو ادب کی آن بان اور شان کو محفوظ رکھا، ان کی گفتگو کے پیش نظر، مَیں انھیں مہمان شاعر کہوں تو غلط نہیں ہوگا۔ ہر سوال کے جواب میں انھوں نے مجھے اپنی شاعری سے متاثر کر دیا۔ غالبؔ اور میرؔ کے اشعار سے زندگی کی کشمکش اور سمجھوتوں کی ادائیگی بڑی اچھی لگی۔ ان کی شاعری کا انداز، بولنے اور پڑھنے کا سلیقہ، درد میں ڈوبی ہوئی آواز، اپنا پن، سادگی، آسان لفظوں کی ادائیگی اور چہرے سے ایسی نورانیت جھلک رہی تھی کہ ہر لحاظ سے شاعر دِکھیں۔ ان کو ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں مہارت ہے اردو کے ساتھ ساتھ انھوں نے مجھے اپنا ہندی کلام بھی سنایا۔ جو ہر لحاظ سے ہندی والوں کے لیے بھی قابلِ قبول ہے۔ شاعر سچ میں اسے ہی کہتے ہیں۔ رفعت سروش صاحب کے انعامات، کتابوں اور ان کے کاموں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ میری چھوٹی سی گاگر میں کہاں سمائے گی۔ میں چاہوں بھی تو گاگر میں ساگر کو نہیں بھر سکتی۔ صرف اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ گودڑیوں میں ہی لعل دمکا کرتے ہیں۔ رفعت سروش وہ لعل ہیں جنھوں نے زندگی کی کشمکش میں سفر طے کیا اور آج بھی مشعل لیے ہمیں راستہ دکھا رہے ہیں۔ (خدا انھیں لمبی عمر عطا فرمائے۔)

سوال ا: آپ شاعری سے متاثر کیسے ہوئے؟ اور اس بلندی تک کیسے پہنچے۔ کیا شاعری یقیناً زندگی میں امید، سنجیدگی اور امنگ کا اتنا بدلاؤ اور تال میل لانے کی طاقت رکھتی ہے؟

جواب: ایسا ہے مکتی جی! میں جس گھر میں پلا بڑھا وہاں منشی اور منشی کامل کے طلبا میرے بھائی مولانا ممتاز علی سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ خود ایک اچھے شاعر تھے اور اپنے

شاگردوں کوشاعری کے نکات سے واقف کراتے تھے۔ چونکہ میرا بچپن موانہ ضلع میرٹھ میں ان کے ساتھ ہی گزرا اس لیے مجھے بھی شاعری سے لازماً دلچسپی ہوگئی۔ ۱۹۳۸ء کی بات ہے جب میں قریب ۱۰-۱۲ سال کا ہی تھا، آپ یقین نہیں کریں گی ان دنوں میں نے ایک شعر کہا تھا ؎

اگر گل دکھاتا ہے آثارِ نکہت
تو کرتا گلچیں تشدّد نمائی

مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ اُس وقت میرا رُخ شاعری کی طرف کیسے جھکا۔ ماحول کا اثر کتنا اہم ہوتا ہے۔ یہ شعر میرے مزاج اور میری زندگی کی تصویر کھینچتا ہے۔ میں ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا، میں آٹھویں جماعت میں تھا اور ایک ڈپٹی کلکٹر اسکول کا معائنہ کرنے آئے تھے انھوں نے کہا کہ ہر بچے کو اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور بنانا چاہیے۔ مجھ سے پوچھنے پر میرا جواب تھا ''میں ایک شاعر بننا چاہتا ہوں۔'' سومکتی جی میں نے ۱۹۴۱ء تک نگینہ میں رہ کر شاعری کی۔

سوال ۲۔ تو کیا آپ نے ۱۹۴۱ء کے بعد شاعری چھوڑ دی؟ اگر چھوڑ دی تو کیوں؟

جواب : میرا جھکاؤ مصوری کی طرف بہت تھا۔ مصوری کا میری زندگی میں ایک بہت اہم کردار ہے۔ میں نے سب سے پہلے شاہ جہاں کی تصویر بنائی جس پر مجھے انعام بھی ملا، لیکن میرے بڑے بھائی نے کہا کہ مصوری ایک بہت بڑا گناہ ہے سو میں انسانوں کے بجائے پیڑ پودوں کی مصوری کرنے لگا، جس کا عکس میری شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ اس مصوری نے آڑے دنوں میں میرا کافی ساتھ دیا۔ اکثر چادروں، تکیوں، دوپٹوں اور ساڑیوں پر بیل بوٹے بنا کر میں نے پیسہ کمایا اور اپنی روزی روٹی چلائی۔ پھر ۱۹۴۲ء میں میں نے جدید شاعری شروع کی اس کا محرک لاہور کا ''حلقہ اربابِ ذوق'' تھا۔ انھیں دِنوں میری ملاقات اختر الایمان سے ہوئی اور میرا حوصلہ بڑھا۔ میری شاعری لاہور کے بڑے رسالوں ''شاہکار''، ''ہمایوں'' اور ''ادبی دنیا'' میں چھپنے لگی اور یہاں سے میرے ادبی سفر شروع ہوا۔ میری پہلی نظم تھی ''گلاب کا پھول''۔ پھر ''اندھیری رات'' اور ''نجم سحر'' وغیرہ جیسی نظمیں کہیں اور میرے اندر کا مصور جاگ اٹھا اور مجھے قدرتی شاعری کی طرف لے آیا۔

اس کے بعد میں ۱۹۴۳ء میں دہلی آیا یہاں مسلسل دو سال میں نے قدرتی شاعری پر ہی لکھا۔ اس دوران میری ملاقات مجاز سے ہوئی ان کی وجہ سے میرا رجحان ترقی یافتہ ادب کی طرف ہوا۔ اس نشیب وفراز اور جدوجہد کی دنیا میں شاعری اور مصوری کے خوابوں کے دور سے گزرتے ہوئے ۱۹۴۵ء میں فلم نگری ممبئی میں اپنی قسمت آزمانے آپہنچا۔

سوال ۳۔ اس فلم نگری میں پہنچ کر تو ہر کوئی پروڈیوسر، ڈائرکٹر بننے کا خواب دیکھنے لگتا ہے، کیا آپ کے ساتھ ایسا کبھی ہوا؟

جواب: ہوا، میں دہلی میں بہت مشہور ہو گیا تھا اس لیے ممبئی آ گیا تھا کہ فلمی گانے لکھوں گا۔ لیکن ۵-۶ مہینے کی کوشش میں ناکامی ہی رہی۔ اتفاق سے میری ایک نظم ''نیا ادب'' رسالے میں چھپی۔ ان دِنوں سیّد ذوالفقار بخاری آل انڈیا ریڈیو کے اسٹیشن ڈائرکٹر تھے انھوں نے وہ نظم پڑھی اور انٹرویو کے لیے بلایا اور اس طرح ممبئی ریڈیو میں نوکری ملی اور اس طرح ایک طرف میری شاعری دوسری طرف میری ریڈیو رائٹنگ میری زندگی تھی۔

سوال ۴۔ بالی ووڈ کی دنیا ممبئی پہنچ کر آپ کی شاعری آپ کا وسیلہ بنی، وہاں آپ کو کئی دوسرے ادیبوں اور شاعروں کا ساتھ بھی ملا ہوگا جنھوں نے آپ کو ترغیب دی ہوگی؟

جواب: ممبئی میں میں ایک اہم قلم کار کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔ ان دنوں ریڈیو ایک بڑا اہم میڈیا تھا جس میں بڑی نامی گرامی ہستیاں پروگرام کرنے آتی تھیں۔ جیسے سردار جعفری، کیفی اعظمی، سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس اور دیگر عظیم ہستیاں۔ میں بھی اس گروپ کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اس وقت ہندوستان کی ''ادبی دنیا'' کے جانے مانے شاعروں میں میرا نام بھی شمار ہونے لگا۔

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میں منعقد ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں مَیں نے حصہ لیا۔ وہاں فراقؔ گورکھ پوری، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، قاضی عبدالستار وغیرہ ان تمام شخصیتوں نے مجھے بہت ہی متاثر کیا اور میں نے اُردو ادب کی وسیع دنیا کو دیکھا۔

سوال ۵۔ آپ کو شاعری کے ساتھ ساتھ اوپیرا (Opera) میں بھی مہارت حاصل ہے کیا آپ اپنے اوپیر کے نام اور کہاں پیش ہوئے، اس کی تفصیل بتائیں گے؟

جواب: آپ نے Opera کے بارے میں بات کی لیکن اس سے پہلے میں ریڈیو کے لیے Verse Plays لکھے اور پروڈیوس کیے جو بہت مقبول ہوئے اور شائع بھی ہوئے۔ لیکن اوپیرا اس سے مختلف ہے۔ 65-1964 کی بات ہے جب میں دہلی ریڈیو اسٹیشن میں ایک رائٹر پروڈیوسر کی حیثیت سے تبادلے پر آچکا تھا، مجھے سمترا چرت رام نے تاج محل پر Belle لکھنے کی پیش کش کی جو خاص طور سے غیر ملکی سیاحوں کے لیے تیار کرنا تھا۔ یہ میرا Stage کا پہلا Opera تھا جسے ''بھارتیہ کلا کیندر'' نے سرودنواز جناب امجد علی خاں کے موسیقی اور کرشن کمار کی کیروگرافی کے ساتھ تیار کیا اور اسے مسلسل ۵ مہینے تک ہوٹل شیراز میں دکھایا گیا۔

۱۹۸۰ء میں یہی اوپیرا شاہ جہاں کا خواب ''پھول والوں کی سیر'' کے جشن میں ''کتھک کیندر'' اور ''بھارتیہ کلا کیندر'' نے مل کر پیش کیا۔ ۱۹۷۰ء میں جہاں آرا اوپیرا لکھی جس کی موسیقی ڈاکٹر شنو کھرانہ نے اپنے ذاتی ادارے گیتکا کے لیے تیار کی اور یہ اوپیرا سپرو ہاؤس دلّی کے علاوہ چندی گڑھ، لکھنؤ اور حیدرآباد میں بھی دکھایا گیا۔ بلراج ورما نے اس کے متعلق ایک بھرپور مضمون لکھا۔ اس کے علاوہ ''روشنی'' جو گاندھی جی کی وفات پر دکھایا گیا اور ''شیریں فرہاد'' جسے ریڈیو سیلون پر پیش کیا گیا۔

اس کے علاوہ دوسرے اوپیرا بھی ہیں جیسے ''شانِ مغل''، ''انارکلی''، ''حبہ خاتون''، ''تماشا میرے آگے''، ''مانو ادھیکار''، ''رنگ بسنتی''، ''ساون بھادوں''، ''ڈگر پنگھٹ کی''، ''قسمت کے پھول'' اور ''روشنی کا کارواں'' جو ۱۹۸۴ء میں ایوانِ غالب میں اُردو اکیڈمی کے تعاون سے پیش کیا گیا۔

ریڈیو کے لیے پروین رائے جو ایک رقاصہ تھی جس پر اوپیرا ہوا۔ رنگ بسنتی اور ساون بھادوں، مشہور مغنیہ نینا دیوی نے ٹیلی ویژن پر خود پیش کیے۔ منظوم ریڈیائی ڈراموں میں نئی صبح World Peace پر ''پروازِ آدم''، ''زمین آدم'' اور ''وقت گیت گاتا ہے'' مجھے بہت اچھے لگے۔ اور ہاں ہندوستان کی آزادی پر میرا پہلا اوپیرا جو ۱۵ راگست پر دکھایا گیا ''ہندوستان شادمانی کے دروازے پر''۔

سوال ۶: آپ کے وقت کے مشہور شاعر جیسے کرشن موہن، بانی، راہی، کمار پاشی، مخمور سعیدی، مخمور جالندھری اور بلراج کومل سب چوٹی کے شاعر تھے اور ہیں مگر شہرت اور انعامات سب سے زیادہ آپ نے ہی حاصل کئے، اس کا سہرا کس کے سر جاتا ہے؟

جواب: مکتی جی! بنیادی طور پر اس کی وجہ میری شاعری ہی ہے۔ اور ان نقادوں کے سر بھی سہرا ہے جنھوں نے میری شاعری کو سمجھا، مانا، لیکن مجھے شکایت ہے کہ جو پہچان مجھے پہلے ملنی چاہیے تھی وہ نہیں ملی اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے ہم عصر لوگوں کی کتابیں پہلے آگئیں اور میری بعد میں چھپیں کیوں کہ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ کتابوں کے چھپنے کا بڑا اثر ہوتا ہے۔

سوال ۷: ہم جس زندگی کی کشتی پر سوار ہیں یہ کب ڈگمگا جائے کون سا جھٹکا کہاں لے جائے؟ لیکن ان گردشوں سے گزر کر بھی آپ ایک سپہ سالار کی طرح جنگ لڑتے رہے، یہ کیسے ممکن ہوا؟

جواب: غالبؔ نے فرمایا کہ:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

غالبؔ کے اس شعر کی تشریح ہی میری زندگی کا نچوڑ ہے۔ آج تک میں نے ناامیدی کو پاس نہیں آنے دیا اور بڑے صاف لہجے میں کہتا ہوں جیسا کہ میرؔ نے کہا ہے:

بڑے سلیقے سے میری نبھی محبت سے
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

مکتی جی! میں ہر مشکل میں کھڑا رہا مجھے احساس ہونے لگا کہ میرے ساتھی مجھے نظر انداز کر رہے ہیں لیکن میرے قلم نے لکھا:

کہاں کہاں بجھاؤ گے میری نوا کی مشعلیں
تمام زندگی کو نغمہ وار چھوڑ جاؤں گا
میں حرف حرف ہوں سروشؔ اک یقینِ زندگی
میں لفظ لفظ اپنا اعتبار چھوڑ جاؤں گا

اور مسکراتے ہوئے کہا یہ میری قوت ہے کہ میں ناکامی سے نہیں ڈرتا، بیماری آئے گی چلی جائے گی، مجھے زندگی کا یقین ہے اور خدا کی ذات پر ایمان بھی۔

سوال ۸: بیماریوں اور موت کے سائے میں رہ کر آپ نے زندگی کو جس خوبصورتی سے سنورا اور برتا ہے یہ ایک ادبی فنکار کی فطرت سے پرے کی بات ہے۔ مجھے اس میں ادبی پہلو سے ہٹ کر ایک نئے آدمی کا جنم، جو دیکھ رہا ہے، سمجھ رہا ہے، سمجھا رہا ہے، یہ چنتن اوستھا کا سروپ آسان نہیں مانا جاتا، اس کی گہرائیوں میں کہیں صوفی، سنت کا سادرشن تو کہیں ایک گھریلو آدمی کا عکس دکھتا ہے یہ کیسے؟

جواب: جب آدمی زندگی گزار رہا ہوتا ہے تو اس کا مقصد ہمیشہ اسے اس سے بہتر بنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے؟ میں لاابالی شاعر بن کر نہیں جیا میں نے اپنی شامیں بار میں نہیں گزاریں، گھر سے بے نیازی نہیں برتی۔ ان سب باتوں نے مجھے ایک خوبصورت زندگی دی۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
(علامہ اقبال)

میں نے اپنے بچوں کی پرورش کے لیے کسی سے کوئی سہارا نہیں لیا۔ سماجی رتبے اور دوستوں کے تعلقات کا بھی لحاظ رکھا۔

سوال ۹: آپ کی وہ نظم جو آپ کو سب سے زیادہ اچھی لگتی ہو، میں سننا چاہوں گی؟

جواب: نظم سنیے۔ عنوان ہے ''بچپن''

ایک چھپر کا گھر نیم کے سائے میں
اونگھتا ہے دھند لکے میں لیٹا ہوا
شام کا وقت ہے اور چولہا ہے سرد
صحن میں ایک بچہ برہنہ بدن
باسی روٹی کا ٹکڑا لیے ہاتھ میں
سر کھجاتا، ہے جانے ہے کس سوچ میں

اور اُسارے میں آٹے کی چکی کے پاس
ایک عورت پریشان، خاطر اداس
اپنے رخ پر لیے زندگی کی تھکن
سوچتی ہے کہ دن بھر کی محنت کے بعد
آج بھی روکھی روٹی ملے گی ہمیں
تم حقارت سے کیوں دیکھتے ہو اسے
دوست یہ میرے بچپن کی تصویر ہے

سوال ۱۰: بہت خوب آپ کی شاعری گلوبلائزیشن سے کتنی جڑی ہے۔لٹریچر میں ترقی پسند نظریات یا فن برائے فن۔کیا ان دونوں کا ہونا شاعروں کو متاثر کرتا ہے؟

جواب: آج نیا نعرہ لگا ہے گلوبلائزیشن کا۔ہم ترقی پسند مصنفوں نے اپنے آپ کو کبھی بھی جغرافیائی حدوں میں محدود نہیں سمجھا بلکہ دنیا کو اپنا گھر تصور کیا۔اقبال نے صحیح کہا تھا ؎

نہ میں اعجمی نہ ہندی نہ عراقی وحجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

ترقی پسند تحریک نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ادب کو وطنیت کی حدوں سے آگے بڑھ کر اسے آفاقیت دی اور دنیا میں جہاں جہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے سروکار رکھا۔ہم لوگوں نے ورلڈ پیس کا نہ صرف خواب دیکھا بلکہ اس کے لیے جدوجہد بھی کی۔انسانیت کے درد کو اپنا درد سمجھا۔میں سمجھتا ہوں کہ گلوبلائزیشن کا یہی مطلب ہے۔ہمارے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

گو میرے دل کے زخم ذاتی ہیں
ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں

سوال ۱۱: آج کی شاعری، پرانی شاعری اور آنے والی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اچھی شاعری اپنے وقت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ہم جسے پرانی شاعری کہتے ہیں وہ پرانے وقت کی تھی۔آج جو شاعری ہو رہی ہے وہ آج کے ماحول کی عکاسی کرتی ہے

اور کل جو شاعری ہوگی اس میں کل کا ماحول ہوگا لیکن ایک بات بہت اہم ہے کہ سچا اور اچھا شاعر ہمیشہ Basic Value کو لے کر چلتا ہے۔اس لیے اگر آج ہم ان Basic Value کا اپنا Subject بناتے ہیں تو کل بھی اس کا اثر باقی رہے گا۔

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

سوال ۱۳: پچھلے ایک صدی میں جس طرح ہواؤں میں بدلاؤ آیا اسے دیکھ کر آپ کو اپنی شاعری میں کیا تبدیل کرنی پڑی؟

جواب :ابھی ایک نعرہ اٹھا تھا مابعد جدیدیت۔ مجھے لگا کہ یہ تصور ہر زمانے میں ہی میرے ساتھ رہا جب ترقی پسندی کا دور تھا تو میں نے ان سے ہٹ کر لکھا ہے جب نراشا کی بات ہوئی تو میں نے آشا کی بات لکھی اور اب پچھلے سالوں سے مجھے بہت تکلفیں جھیلنی پڑیں۔ نیچرل کلائمٹی نے میری شاعری پر بہت اثر کیا میرے اپنے تاثرات بدلے کیوں کہ میری زندگی میں بدلاؤ آیا پھر بھی میں نے Negative یعنی منفی رویہ سے گریز کیا۔ آشاوادی رہا۔اور آج تک ویسا ہی لکھتے آ رہا ہوں۔

سوال ۱۳: آپ کے بیٹے نوید نے مجھے بتایا کہ وہ آپ کے وطن نگینہ میں آپ کے نام کے ساتھ وابستہ لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے۔اور میں ان کی پر زور تائید کرتی ہوں؟

جواب: بھکتی جی! سوچنے اور کرنے میں بہت فرق ہے۔

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

سوال ۱۴: قومی اردو کونسل کی کوشش اردو کے سلسلے میں کیسی لگی؟

جواب :قومی اردو کونسل ایک ملٹی پر پز ادارہ ہے جس میں کتابیں چھاپنا، رائٹرز کو امداد دینا بہت دنوں سے چلا آ رہا ہے۔ لیکن پچھلے کچھ سالوں سے اس ادارے نے اردو تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے جو نئے قدم اٹھائے ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ خاص طور پر یہ کونسل ضرورت مند اداروں کو کمپیوٹر مہیا کراتی ہے اور اس وجہ سے کمپیوٹر پر اردو میں کام کرنے کی

تعداد بڑھ رہی ہے اور روزگار کے مواقع میسر ہو رہے ہیں۔ انھوں نے کئی جگہ پر کتاب میلے بھی لگوائے جس کی وجہ سے لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق بھی بڑھا ہے۔ ان کی کتابوں کی قیمت بھی بہت کم رکھی جاتی ہے۔ جس میں علمی اور تنقیدی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں یہ ادارہ ایک اچھا کام انجام دے رہا ہے۔ ان کے دو اہم رسالے نکلتے ہیں ''فکر و تحقیق'' جس میں تنقیدی اور تحقیقی مضامین شامل ہوتے ہیں اور ''اُردو دنیا'' جس میں معلوماتی مضامین کے علاوہ اردو دنیا کے متعلق خبریں بھی شائع ہوتی ہیں۔ ایک ہے ''اردو درپن''۔ میں امید کرتا ہوں کہ قومی اُردو کونسل اسی طرح فعال رہے گی اور اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے نئے نئے اقدامات کرتی رہے گی۔ ملکی حالات کے تناظر میں یہ ادارہ اُردو کے لیے حیاتِ ثانیہ کے مترادف ہے۔

[بشکریہ: اردو دنیا، نئی دہلی]

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

GHALIB INSTITUTE

AIWAN-E-GHALIB MARG, (MATA SUNDRI LANE)
NEW DELHI - 110 002

شامِ شہریاراں

(پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی سیکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کا ایک نیا قدم)

عرصے سے دہلی میں پرانی ادبی محفلیں بکھری ہوئی ہیں۔ اور دانشوروں کے وہ نئے ٹھکانے بھی جو خود بخود کافی ہاؤس جیسی جگہوں میں بن جاتے تھے اب نہیں بنتے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے غالب انسٹی ٹیوٹ نے ہر مہینے کے آخری جمعے کو ساڑھے پانچ بجے ''شامِ شہریاراں'' کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس شام کا نہ کوئی باقاعدہ ایجنڈا ہوتا ہے نہ پہلے سے طے شدہ موضوع بحث اور نہ صدارت ونظامت وغیرہ کے تکلفات۔ دانشور حضرات سے گذارش ہے کہ وہ تشریف لائیں اور کافی کی پیالی کے ساتھ کوئی بھی موضوع چھیڑیں، اہلِ قلم پر یہ پابندی بھی نہیں کہ وہ اپنی تحریریں نہ پڑھیں۔

یہ سلسلہ بروز جمعہ ۳۰/اپریل ۲۰۰۴ء کو ساڑھے پانچ بجے ایوانِ غالب میں تشریف لانے کی شروع ہوا تھا اور آج تک جاری وساری ہے۔ منتظمین دانشوروں سے نجی طور پر، خط کے ذریعے اور اخبارات کے وسیلے سے اطلاع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ اہلِ مذاق اس منصوبے کی پذیرائی کریں گے۔

مدیر تناظر، دہلی

ایک خط

ایک یارِ دیرینہ کا جو محبوب کی مدر انڈیا کا رائٹر تھا اور جانتا تھا کہ اُردو نا میری مادری زبان ہے نا مکتبی (بلراج ورما)

بھیا جان—اور جانی

میں حیران ہوں کہ آخر تم دونوں کے پاس کتنی دولت ہے جو تم اردو کے عشق میں لٹاتے ہی چلے جا رہے ہو—جو تمہاری مادری زبان بھی نہیں! اتنا پیار تو میں نے سگی اولاد کو بھی سگی ماں سے کرتے نہیں دیکھا۔

ہر شمارہ میں ہزاروں کا 'پھٹکا' تو تم دونوں کو لگتا ہی ہوگا۔ کیونکہ مجھ کو کچھ اندازہ ساجد رشید کے سہ ماہی سے ہے جو مجھ کو پسند ہے اور میں جس کی ہر طرح مدد کرتا رہتا ہوں کہ بند نہ ہونے پائے۔

جو جتن کر کے رسالہ مرتب کرتے ہو وہ وسعت مضامین سے عرق ریز ہوتا ہے۔ غزل لب گور ہو چکی تم تگ و دو کرتے رہتے ہو کہ دفن نہ ہونے پائے مگر تم وقت سے ٹکرار ہے ہو۔ سیکڑوں کے بعد ایک شعر زندہ لگتا ہے ورنہ ہر شعر شعر کی فاتحہ ہوتا ہی ہے۔

اب قسم اٹھا کر اپنی جان جوکھم میں ڈالے ہی ہو تو اور خون پلاؤ اور وقت کے دھڑکتے بلبلاتے مسائل کے مضامین کو رسالہ کی زینت بناؤ۔

تقریباً ہر Ism کی موت ہو چکی ہے مگر زندگی اپنی بقا کی فکر کے عنوان کی متلاشی ہے باقی سب زٹلی ہے۔

تمہارا مداح

علی الرضا

رسالہ کو اس کا نقیب بناؤ۔ اور جیتے رہو۔

بی 31/32 بنہا کواپریٹوٹ ہاوسنگ کامپلکس
جوہوتارہ روڈ، جوہو، ممبئی-49

سلام بن رزّاق

مہابھارت کی روایت اور اُردو افسانہ

راماین اور مہابھارت سنسکرت زبان کے دو عظیم رزمیے ہیں۔ ہندوستان کی ہر زبان کے ادب پر ان کتابوں کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اردو ادب کا دامن بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ شاعری کے علاوہ ناول اور افسانے میں بھی ان عناصر کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ بالخصوص مہابھارت کا پلاٹ، اس کے کردار، اس کے واقعات اس قدر پہلو دار ہیں کہ ہزاروں سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کی دلچسپی اور تازہ کاری میں فرق نہیں آیا ہے۔ ہر عہد میں اس کے قصوں اور کرداروں کو نئی نئی جہتیں دی گئی ہیں۔ اس کتاب میں اسرار و معانی کا ایسا خزانہ پوشیدہ ہے کہ جس سے ہر زبان کے ادیب اور شاعر اپنی اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کرتے آئے ہیں۔

مراٹھی، بنگالی، ہندی، کنڑ اور ملیالم زبانوں میں مہابھارت کے پس منظر میں صرف افسانے ہی نہیں بڑے بڑے ناول بھی لکھے گئے ہیں۔ علاقائی زبانوں کے ادب میں ان کا مقام بہت بلند ہے مگر اردو میں مہابھارت کے پس منظر میں فکشن کا کوئی ایسا نمونہ پیش نہیں کیا گیا ہے جسے شاہکار کا درجہ حاصل ہوتا۔ البتہ افسانوں میں اِدھر اُدھر مہابھارت کے اجزاء بکھرے نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں کسی ایک واقعہ یا کردار کو لے کر پورا افسانہ بھی تخلیق کیا گیا ہے۔

یہاں چند افسانوں کا جائزہ لیا جاتا ہے جن کی اساس مہابھارت کے واقعات یا کرداروں پر رکھی گئی ہے۔ یوں تو کئی افسانہ نگاروں کے افسانوں میں دیومالا یا مہابھارت کے اکّا دکّا حوالے مل جاتے ہیں تاہم ان میں انتظار حسین اور سریندر پرکاش کے افسانوں میں دیومالائی عناصر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ تخلیقی پیکروں میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔

سریندر پرکاش جدید افسانے کا ایک اہم نام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ”کہانی کار بوڑھا ہوجاتا ہے مگر کہانی بوڑھی نہیں ہوتی“ سریندر پرکاش کے پاس بھی چند ایسی کہانیاں ہیں جن

کی چمک دمک عرصے تک باقی رہے گی۔ ان کے دو افسانے ''پیاسا سمندر'' اور ''گاڑی بھر رسد'' مہابھارت کے واقعاتی پس منظر میں بیان کیے گئے ہیں۔ ''گاڑی بھر رسید'' میں مہابھارت کے 'بکاسر' والے واقعے کو آج کے تناظر میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ پورا افسانہ جبر و استبداد اور مظلومیت کا استعارہ بن جاتا ہے۔

مہابھارت میں بکاسر راکشس کی بھوک مٹانے کے لیے بستی والے روزانہ گاڑی بھر اناج اور ایک زندہ آدمی بھیجا کرتے تھے۔ ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی یہ رسم جاری ہے اور بستی والے اب پہاڑ کے اُس طرف رہنے والے جن یا راکشس کے لیے گاڑی بھر اناج اور ایک زندہ آدمی بھیجنے پر مجبور ہیں۔ گویا جگہ دل جائے، حکومت بدل جائے، زمانہ بدل جائے مگر بکاسر کی بھوک ختم نہیں ہوتی۔ اور یہ کہ مذہب اور سیاست کے نام پر ایک عام آدمی کا ہر عہد میں استحصال کیا گیا ہے۔ کہانی کی خوبی یہ ہے کہ پوری کہانی میں کہیں بکاسر کا ذکر نہیں ہے مگر شروع سے آخر تک بکاسر کی دہشت کسی مہیب سایے کی طرح کہانی پر چھائی رہتی ہے۔ کہانی میں کہیں مہابھارت کا حوالہ نہیں ہے مگر کہانی کا تانا بانا کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ قاری اپنے آپ کو مہابھارت کال میں سانس لیتا محسوس کرتا ہے۔ اور جب پروہت کہتا ہے کہ:

''ہزاروں برس پہلے اس کے ساتھ یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ ہمارے گاؤں پر کوئی آفت نہیں ڈھائے گا بلکہ قدرت اور انسانوں کے قہر سے ہماری حفاظت کرے گا۔ یہ معاہدہ ہمارے لیے ایک متبرک رسم کی صورت اختیار کر گیا ہے۔''

تب اچانک محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ تو مہابھارت کی نہیں ہماری اپنے عہد، اپنی بستی اور اپنے آس پاس کی کہانی ہے، جہاں حکومت کا جبر اور مذہب کا قہر آج بھی بکاسر کی طرح اس کی جان کا خراج وصول کر رہا ہے۔

بکاسُر کے استعارے کو ایک اور افسانہ نگار شرون کمار نے اپنے افسانے ''کچھ نہیں ہوگا'' میں ایک دوسرے انداز سے برتا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ بھیم بکاسر کا ودھ کرنے کے بعد اُس کی لاش کو جنگل میں چھوڑ کر چلا گیا۔ پانچ ہزار برس بعد لاش میں حرکت ہونے لگتی ہے،

لوگ خوف زدہ ہوجاتے ہیں۔ حکومت حرکت میں آتی ہے مگر اچانک لاش غائب ہو جاتی ہے اور پھر بکا سر کبھی کسی آفیسر کی کُرسی پر نظر آتا ہے تو کبھی منسٹر کے آسن پر۔ اس طرح بکا سر بدعنوان اور رشوت خور سرکاری افسروں اور منسٹروں کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ گویا رشوت خور سرکاری ملازم ایسے بکا سر ہیں جن کی طلب بکا سر راکشس کی بھوک کی طرح کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بدعنوانی کے خلاف ''کچھ نہیں ہوگا'' ایک مؤثر استعاراتی کہانی ہے۔ یہاں سریندر پرکاش کی ایک اور کہانی ''پیاسا سمندر'' کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ یہ محبت اور شہوت کی کشمکش کی کہانی ہے۔

پربھاکر پنڈت ایک پیشہ ور کتھا واچک میں ہیں۔ وہ رامائن کی کتھا پڑھتے ہیں مگر اپنے آپ کو ''رادھے بھگت'' کہتے ہیں۔ وہ ''شبھ'' نام کی ایک شادی شدہ عورت سے محبت کرتے ہیں جس کے دو بچے ہیں۔ وہ عورت بھی ان پر دل و جان سے فریفتہ ہے مگر پنڈت جی اُس سے جسمانی رشتہ قائم کرنے کی ہمت نہیں جٹا پاتے۔ مگر جب ان پر جنس کا غلبہ طاری ہوتا ہے تو تنہائی میں شبھ کی تصویر کے سامنے ننگ دھڑنگ ہو کر غالباً خیالوں میں اس سے جنسی تلذذ حاصل کرتے ہیں۔ اس دوران ایک دوسری عورت جس کا نام کنتی ہے، پنڈت جی پر عاشق ہو جاتی ہے اور اُن سے جسمانی رشتہ قائم کرنے کے لیے اصرار کرتی ہے۔ پنڈت جی منع کرتے ہیں۔ جب عورت زبردستی کرتی ہے تو پنڈت جی کھڑکی سے کود کر اپنی جان دے دیتے ہیں کیونکہ وہ شبھ سے بے وفائی نہیں کر سکتے تھے۔

بہ ظاہر کہانی کا پلاٹ سیدھا سادہ نظر آتا ہے مگر پنڈت جی کا ایک جملہ جو وہ خط میں اپنی محبوبہ شبھ کو لکھتے ہیں، کہانی کو مہابھارت کے کرداروں کے روبرو لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ پنڈت جی لکھتے ہیں: ''منشیہ اپنی مرتیو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ دُریودھن اگر اپنی ماتا گندھاری کے سامنے لنگوٹ پہن کر نہ جاتا تو کبھی نہ مرتا۔'' یہ جملہ کہانی کے رمز کو کھولنے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ''گندھاری اپنے اندھے شوہر دھرت راشٹر کی محبت میں آنکھوں پر پٹی باندھے رہتی تھی۔ اس ''پتی پریم'' کے سبب اس کی آنکھوں میں ایک تجلی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ

اپنے بیٹے دریودھن سے کہتی ہے۔ ”تم بے لباس ہوکر میرے پاس آؤ، میں اپنی نظر کی شکتی سے تمہارے جسم کو امر کر دوں گی۔ میری نظر تمہارے جسم کے جس حصے پر پڑے گی اس پر دنیا کا کوئی ہتھیار اثر نہیں کر سکے گا۔“

دریودھن ماں کے سامنے ننگا ہوکر آتا ہے مگر عین وقت پر مارے شرم کے ایک لنگوٹ سے اپنا ستر چھپاتا ہے۔ گندھاری اپنی آنکھوں سے پٹی کھولتی ہے اور دریودھن پر نظر ڈالتی ہے۔ لنگوٹ والے حصے کو چھوڑ کر اس کے جسم کا باقی حصہ امر ہو جاتا ہے۔ گندھاری ناراض ہوتی ہے مگر جو ہونا تھا ہو چکا۔ یہ بات صرف کرشن کو معلوم ہے۔ میدان جنگ میں دریودھن پر کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا تب کرشن بھیم کو اشارہ کرتے ہیں کہ ان کی ران پر وار کرو۔ بھیم گرز سے ران پر وار کر کے اس کی ٹانگ توڑ دیتا ہے۔ اس طرح دردیوھن کی موت واقع ہوتی ہے۔ گویا دریودھن کا اپنی ماتا گندھاری کے سامنے لنگوٹ پہن کر جانا ہی اس کی موت کا سبب بنا۔ معنی اس کی لاج ہی اس کی موت کی وجہ بن جاتی ہے۔ پربھاکر پنڈت بھی دوسری عورت کنتی کو لاج کے مارے اپنے قریب آنے سے منع کرتے ہیں مگر وہ شہوت میں ایسی اندھی ہوگئی ہے کہ ان کی ایک نہیں سنتی اور پنڈت جی کھڑکی سے کود کر جان دے دیتے ہیں۔

دوسری عورت کا نام کنتی ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کنتی پانڈووَں کی ماں تھی مگر مہابھارت کی روایت کے مطابق جب وہ بلوغ ہوئی تو سورج دیوتا اس پر عاشق ہو گئے اور وہ گربھ وتی ہوگئی۔ اس طرح کرن پیدا ہوا، جو اس کی ناجائز اولاد تھی۔ غالباً افسانے کی کنتی بھی پربھاکر پنڈت سے کچھ ایسا ہی مطالبہ کر رہی ہے کہ وہ سورج دیوتا بن کر ایک بار پھر اس کی کوکھ ہری کر دے۔

اس طرح صرف ایک جملے اور ایک نام کی وجہ سے پورے افسانے کو مہابھارت کا تناظر حاصل ہو جاتا ہے اور افسانہ معمولی سطح سے اٹھ کر استعاراتی فضا میں سانس لینے لگتے ہیں۔

جوگندر پال نے بھی اپنی کہانیوں میں دیو مالا کا کافی استعمال کیا ہے۔ ان کی ایک کہانی ہے ”مہابھارت کی دوسری جنگ“ جس میں ”دروپدی“ نام کی ایک بیوہ اور بے سہارا عورت چوری چھپے جسم فروشی کا دھندا کرتی ہے۔ محلے والوں کو اس کے دھندے کے بارے

میں پتا چل جاتا ہے۔ وہ اسے ذلیل کرتے ہیں تب وہ کہتی ہے۔

''ساری دنیا کوروؤں کی طرح میرا وستر ہرن کرنا چاہتی ہے۔ یعنی مجھے بے آبرو کرنا چاہتی ہے، مگر کوئی آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑنے کو تیار نہیں، مہابھارت کی درو پدی کے تو پانچ پتی تھے، اور خود کرشن بھگوان بھی اس کے مددگار تھے مگر میں تو اکیلی ہوں۔ مہابھارت کی اِس دوسری جنگ میں اکیلی بھلا کیسے لڑ سکتی ہیں۔'' یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے کہ ایک آبرو باختہ عورت بھی سماج کی نگاہوں میں بے آبرو ہونا نہیں چاہتی۔ غالبًا اس کی یہی ''حیاداری'' قاری کی نگاہوں میں اسے ذلیل ہونے سے بچالیتی ہے۔ افسانے کی درو پدی ہمارے آس پاس کی ایسی ہی بے یارومددگار عورتوں کا نمائندہ کردار بن جاتی ہے جو حالات سے مجبور ہو کر جسم فروشی کا پیشہ اختیار کرتی ہیں۔ درو پدی کے نام کی وجہ سے کہانی کو ایک نئی جہت مل جاتی ہے۔

کنور سین کے افسانے ''گلیڈ یٹر'' اور ''دھرت راشٹر'' کے بعد میں بھی مہابھارت کے اجزا پائے جاتے ہیں مگر ان کے اسلوب نگارش پر تجریدیت کا ایسا غلبہ ہے کہ مہابھارت کے حوالوں کے باوجود کہانیاں پیچیدہ اور غیر دلچسپ ہوگئی ہیں۔ ''دھرت راشٹر'' کے بعد افسانے میں غالبًا انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اقتدار کی ہوس انسان کو اندھا کر دیتی ہے اور وہ اپنے راج پاٹ کو بچانے کی خاطر ظلم وتشدد کو بھی روا رکھتا ہے۔

۷۰ کے بعد کے افسانہ نگاروں نے بھی اپنے افسانوں میں کہیں کہیں ہندو دیو مالا کا استعمال کیا ہے۔ ''حسین الحق'' کی کہانی ''آتم کتھا'' اور قمر احسن کی کہانی ''کل یگ کی علامت'' پر مہابھارت کی روایت کی چھاپ واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہانی زمین سے جڑنے کی بجائے فضا میں تیرتی نظر آتی ہے۔ کہانی بتایا گیا ہے کہ راوی بھاگ رہا ہے اور کتے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ وہ بھاگتے ہوئے کروکشیتر میں پہنچتا ہے جہاں مہابھارت کی جنگ شروع ہونے جا رہی ہے۔ مگر وہ دیکھتا ہے کہ دونوں طرف بے سر کے انسانوں کی فوج ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہے۔ جب وہ نارد جی کی دی ہوئی عینک لگا کر دیکھتا ہے تو دنگ رہ جاتا ہے کہ اب وہاں انسانوں کی بجائے دونوں طرف کتے نظر آتے ہیں۔ آخر میں وہ اس آپا دھاپی سے نجات پانے کے لیے جیب سے چھری نکال کر خود

اپنا سر دھڑ سے جدا کر دیتا ہے اور خود بھی بے سر کے انسانوں میں شامل ہو کر بھیڑ کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اگر اس کہانی کی گرہیں کھولیں تو مفہوم کچھ اس طرح نکل سکتا ہے کہ آج کے معاشرے میں اکثر انسان ایسے ہیں جن کا کوئی کردار نہیں، اس لیے اکثریت بے سر کے انسانوں کی ہے۔ کُتے انسان کے اندر چھپی ہوئی خباثت، درندگی اور چھوٹ کا استعارہ ہو سکتے ہیں۔ کروکشیتر انسان کی ازلی ستیزہ کاری کا استعارہ ہو سکتا ہے جہاں شب و روز نئی مہابھارت چھڑی رہتی ہے اور دونوں طرف بے سر کے انسان ایک دوسرے سے آمادۂ پیکار نظر آتے ہیں۔ آخر میں راوی بھی اپنا سر قلم کر کے بے سر کے لوگوں میں شامل ہو جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے اس طرح یہ کہانی ہر عام آدمی کی ''آتم کتھا'' بن جاتی ہے۔ ''آتم کتھا'' میں مہابھارت کی جنگ کا حوالہ کہانی کو ایک دیو مالائی رُخ عطا کرنے کے ساتھ انسان کے اندر چھپی بربریت اور اس کی بے چہرگی کا اشاریہ بھی بن جاتا ہے۔

ایک اور افسانہ نگار ''قمر احسن'' کے یہاں بھی ماضی کی بازیافت ایک غالب رجحان کی شکل میں نظر آتی ہے۔ یہاں ان کی صرف ایک کہانی ''کل یگ کی علامت'' کو لیا جاتا ہے۔ کہانی کی فضا براہِ راست مہابھارت کال ہی سے ماخوذ ہے۔ مگر کہانی میں جو علامتیں اور استعارے بیان ہوئے ہیں، آج کے معاشرے پر بھی ان کی نہ آسانی تطبیق کی جا سکتی ہے۔ جوئے میں ہارنے کے بعد پانڈوؤں کے بارہ برس کے لیے بن باس اختیار کرنا پڑا۔ ایک دن وہ بھٹکتے بھٹکتے ایک سادھو سے ملتے ہیں۔ سادھو کہتا ہے'' آنے والا زمانہ کل یگ کا ہوگا۔ اپنے سفر کے دوران تمہیں جو سب سے عجیب بات نظر آئے، اسے غور سے دیکھو اور اس کا مطلب جاننے کی کوشش کرو۔ وہی کل یگ کی علامت ہوگی۔ سفر میں انھیں سچ مچ عجیب و غریب باتیں نظر آتی ہیں مثلاً یدھشٹر کو ایک ہاتھی نما جانور دکھائی دیتا ہے جس کے آگے پیچھے سونڈ تھیں، جو ایک طرف سے پانی پیتا ہے اور دوسرے طرف سے پانی نکالتا جارہا ہے۔ بھیم، ارجن، سہدیو اور نکل بھی ایسی ہی عجیب و غریب باتیں دیکھتے ہیں۔ پانچوں کی باتیں سننے کے بعد سادھو کہتا ہے۔ ''یہ سب کل یگ کی علامتیں ہیں۔ ان کا مطلب میں کل صبح تمہیں بتاؤں گا۔ اور کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح افسانہ نگار نے ان علامتوں

کے مفہوم کو سمجھنے کا کام قاری کی استعداد پر چھوڑ دیا ہے۔

کہانی پر قصے پن کا روایتی انداز پوری طرح حاوی ہے اور کہانی پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ ہم کوئی پورانک کہانی یا کسی داستان کا کوئی دلچسپ اور محیّر العقول باب پڑھ رہے ہیں۔ ذرا سا غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ افسانہ نگار نے ہندو دیومالا اور اسلامی حکایتوں سے افسانے کا ملغوبہ تیار کیا ہے۔ مثال کے طور پر کل یگ کی جو علامتیں بیان کی گئی ہیں۔ اسلامی کتابوں میں قربِ قیامت کی علامتیں ان سے ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً قربِ قیامت کی ایک علامت میں بتایا گیا ہے کہ ایک بڑا پرندہ نظر آئے گا جس کے پروں پر قرآن کریم کی آیتیں لکھی ہوں گی مگر وہ گندگی کھا رہا ہوگا۔ اس کا مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ قریبِ قیامت کے زمانے میں عالم بدگوئی کا شکار ہوں گے۔ کل یگ کی علامت میں ارجن بھی ایک ایسا ہی پرندہ دیکھتا ہے جس کے جسم پر دیوتاؤں کے نام لکھے ہیں مگر اس کی چونچ میں مردہ انسانوں کی کھوپڑی ہے۔

افسانہ نگار نے اس کہانی کے ذریعے یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کی ہے کہ زبانیں اور علاقے الگ ہو سکتے ہیں مگر کہانی کا منبع مخرج ایک ہی ہوتا ہے۔ انساں کا اجتماعی شعور ـــــ اسلامی حکایتوں اور دیومالائی داستانوں کے امتزاج سے اردو افسانے کو ایک نئی جہت عطا کرنے والوں میں انتظار حسین کا نام سرفہرست ہے۔ اس ضمن میں ان کی کئی کہانیوں کے حوالے دیے جا سکتے ہیں مگر یہاں ان کے تازہ ترین افسانے ''مورنامہ'' کا مختصر سا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے جس میں حال ہی میں ہونے والے ایٹمی دھماکے اور ان کی تباہ کاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہانی کی جڑوں کو مہابھارت کی زمین میں دریافت کر کے افسانہ نگار نے کہانی کو مزید دلچسپ اور فکر انگیز بنا دیا ہے۔ افسانے کا محرک ایک چھوٹی سی خبر بنتی ہے کہ جب ایٹمی دھماکہ ہوا تو راجستھان کے مور سراسیمگی کے عالم میں جھنکارتے، شور مچاتے اپنے گوشوں سے نکلنے اور حواس باختہ فضا میں تتر بتر ہو گئے۔ اسلامی روایت کے مطابق مور جنت کا جانور ہے اور ہندو دیومالا کے مطابق وہ دیوتاؤں کی سواری ہے۔ وہ نہ صرف فطرت کے حسن کے بقا کی علامت ہے بلکہ مسرت و انبساط اور پاکیزگی کا بھی استعارہ ہے۔

ایٹمی دھماکے سے موروں کے غائب ہو جانے کے بعد راوی موروں کی تلاش میں نکلتا ہے تب اسے ''مہابھارت'' کی جنگ کا سب سے ملعون اور منحوس کردار اشوتھاما دکھائی دیتا ہے۔ اشوتھاما، درونا چاریہ کا بیٹا تھا اور مہابھارت کی جنگ میں کوروؤں کے ساتھ تھا۔ درونا چاریہ کو دیوتوؤں سے ''برہم استر'' کا وردان ملا تھا۔ ''برہم استر'' ایسا ہتھیار تھا جس کے استعمال سے دنیا کے تمام ''جیو جنتو'' فنا ہو سکتے تھے۔ درونا چاریہ نے ''برہم استر'' کا راز صرف اپنے چہیتے شاگرد ارجن کو بتایا تھا۔ جنگ میں استاد اور شاگرد ایک دوسرے کے مقابل آ کھڑا ہو جاتے ہیں مگر دونوں ''برہم استر'' کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔ مرتے وقت درونا چاریہ ''برہم استر'' کا راز اپنے بیٹے اشوتھاما کو بتا دیتے ہیں۔

جنگ کے بالکل آخر میں جب پانڈوؤں کی جیت قریب تھی، اشوتھاما برھم استر چلا دیتا ہے۔ جس کی مار سے پانڈوؤں کی استریوں کا حمل گر جاتا ہے۔ تب کرشن ناراض ہو کر اُسے شراب دیتے ہیں۔ ''درونا کے پاپی پتر تو نے بالک ہتیا کا پاپ کیا ہے اس لیے میں تجھے شراب دیتا ہوں، تو ہزاروں برس تک اس طرح جیے گا کہ تیرے زخموں سے سدا خون اور پیپ رسا کرے گی اور بستی والے تجھ سے گھن کھائیں گے۔''

روایت ہے کہ اشوتھاما، آج بھی زندہ ہے اور اپنے سڑے گلے بدن کے ساتھ بنوں میں بھٹک رہا ہے۔ انتظار حسین نے اس روایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہانی میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دراصل ''ایٹم بم'' موجودہ عہد کا برھم استر ہے۔ اُسے استعمال کرنے والا اشوتھاما کی طرح انسانی نسل کا قاتل ٹھہرے گا۔ اشوتھاما کو قابلِ نفرت گردانتے ہوئے افسانہ نگار نے، ایٹمی طاقت کا مظاہرہ کرنے والوں سے بھی نفرت کا اظہار کیا ہے اور انھیں آگاہ کیا ہے کہ اس برھم استر کے استعمال سے گریز کرو ورنہ انسانی نسل کی تباہی و بربادی تمہارے سر ہو گی۔

افسانہ نگار نے ایک جگہ بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ''جنگ کے آخری لمحوں سے ڈرنا چاہیے۔ جنگ کے سب سے نازک اور خوف ناک لمحے وہی ہوتے ہیں۔ جیتنے والے کو جنگ کو نبٹانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہارنے والا جی جان سے بیزار ہوتا ہے تو وہ خوف ناک

ہتھیار جو بس ڈرانے دھمکانے کے لیے ہوتے ہیں، آخری لمحوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر بے شک شہر جل کر ''ہیروشیما'' بن جائے، دل کی حسرت تو نکل جاتی ہے۔''

''مورنامہ'' دراصل ایٹمی دھماکوں کے زہریلے اثرات اور ایٹمی جنگ کے ہولناک نتائج کے خلاف ایک افسانہ نگار کا درد بھرا احتجاج ہے اور ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے اہلِ اقتدار کے لیے ایک عبرت انگیز اشارہ بھی ہے۔

دیو مالا یا اساطیر سے مجھے بھی دلچسپی ہے اور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے میں نے بھی حتی المقدور ان سے استفادہ کیا ہے۔ مہابھارت کے حوالے سے یہاں میں اپنے صرف ایک افسانے ''اِکلویہ'' کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

''اکلویہ'' مہابھارت کا وہ بدنصیب کردار ہے جسے درونا چاریہ نے تیراندازی کا فن سکھانے سے اس لیے منع کر دیا تھا کہ وہ ''شودر'' تھا۔ کہانی میں بتایا گیا ہے کہ ہزاروں برس بعد ''اِکلویہ'' دوبارہ جنم لیتا ہے مگر اب کے وہ ''شودر'' نہیں ہے۔ ایک معمولی مزدور کا لڑکا ہے، وہ بارہویں میں ٹاپ کرنے کے بعد جب میڈیکل سائنس میں داخلہ لینے کے لیے کالج جاتا ہے تو وہاں پرنسپل کی کرسی پر وہ درونا چاریہ براجمان ہیں۔ درونا چاریہ اُسے اس بار بھی مایوس لوٹا دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

''اِکلویہ، تو بڑا ابھاگا ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ جب تجھے ہریجن کے گھر میں جنم لینا تھا تو پیدا ہوا غیر ہریجن کے گھر میں، اگر تو آج بھی شودر یا ہریجن ہوتا تو میں آنکھیں بند کر کے تجھے ایسے ہی کوٹے سے سیٹ دے دیتا۔''

اس افسانے میں کوٹا سسٹم کی ناقص پالیسی کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ بے شک پچھڑی ذاتوں کو فائدہ ملے مگر ذہین اور مستحق طلبہ کے ساتھ بھی ناانصافی نہیں ہونا چاہیے۔

بلاشبہ ''مہابھارت'' ہمارے ملک کا بہت بڑا رزمیہ ہے۔ اس میں زندگی کے اسرار و رموز کا ایک جہاں آباد ہے۔ اگر ہمارے ادیبوں نے اس جانب خاطر خواہ توجہ دی تو دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی مہابھارت کی اساس پر فکشن کے اعلیٰ نمونے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

[بشکریہ: اردو دنیا، نئی دہلی]

پروفیسر عتیق اللہ

ایک اقتباس

مصنف کی کتاب ترجیحات میں شامل اُن کے مضمون "تانیثیت: ایک تنقیدی تھیوری" سے

اینگلو امریکی تانیثیئن اپنی فکر میں اضافیت کے قائل ہیں۔ان کے نزدیک ایسی کوئی بنیادی یا لازمی تخصیصات نہیں ہیں جو کسی خاتون ادیب اور مرد ادیب کی تخلیقات و تصنیفات کے مابین حدِ فاصل قائم کرتی ہوں۔ادبی تاریخ میں تخصیصات کو قائم کرنے یا زور دینے والے نقادوں نے محض ایک برخور غلط رجحان یا تعصب کو چلن کے طور پر قبول کیا اور فہم عامہ کے مطابق اپنی ترجیحات متعین کی ہیں۔اینگلو امریکی اسکول نے محض خواتین کے اور خواتین کے لیے تحریر کردہ ادب، اس کے مسائل اور محرکات ہی کو اپنے تجزیے اور مطالعے کا موضوع بنایا ہے اس صورت میں بین التوفی موضوعات کے ساتھ فوق الممتنی دنیا بھی ان کے مطالعے کا معروض بن جاتی ہے۔

امریکہ میں تانیثی مطالعات نے کافی فروغ پایا ہے۔انگلستان میں بھی ان طباعتی اداروں کی تعداد میں روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے جن کا انتظامیہ اور جن کے مالکانہ حقوق خواتین کے ہاتھ میں ہیں۔ان خواتین نے طاقِ نسیانِ ماضی سے کئی ایسے مصنفاؤں کے ادب کو پہلی یا دوسری بار طبع کیا جو یا تو فراموش کردہ تھا یا صحیح قدر افزائی سے تاہنوز محروم۔انہی میں ایچ مارٹینو، ای، بی، براؤننگ اور ایم، سینکلیر جیسی ادیباؤں کے نام بھی ہیں۔تانیثی تنقید، خواتین کے ادب کی تنقید ہی عبارت نہیں ہے۔ بلکہ ان مرد اور ادیبوں کی تصنیفات کو بھی اس نے اپنا موضوع بنایا ہے جن کے یہاں منفی یا مثبت طور پر عورت سے متعلق فہم مترشح ہے۔تانیثی نقادانِ فن نے انہی زاویوں سے ہارڈی، جیورج ایلیٹ، چارلوٹے برونٹے اور جوائسس کے فکر وفن کا تجزیہ کیا ہے۔

□□□

باب عکس: دو فنکار

(۱) بلراج حیرت

از بر

فنا کی دیمک بڑی سے بڑی سوچ کو نگل جاتی ہے اور پیچھے رہ جاتی ہیں چند یادیں چند رفاقتیں چند فسانے۔

باؔنی مرحوم کا شعر ہے:

خاک و خوں کی وسعتوں سے باخبر کرتی ہوئی
اک نظر امکاں ہزار امکاں سفر کرتی ہوئی

بلراج حیرت اپنے شعری انتخاب از بر میں بطور تعارف فرماتے ہیں:

''از بر'' خدمت میں حاضر ہے۔ اس کے آغاز میں کسی دوسرے ادیب یا شاعر کا مقدمہ یا دیباچہ مجھے اس لیے گوارا نہ ہُوا کہ ایسی تحریر میں بالعُموم گُمراہ کن حد تک تعریفی و یک رُخی ہوتی ہیں اور ایسی ایسی باتیں شاعر سے منسوب کر دی جاتی ہیں جن کا سایہ بھی اس غریب پر کبھی نہ پڑا ہو۔ اور میں خود یا اپنی زندگی کے متعلق یا اپنے کلام کے بارے میں کیا عرض کروں؟ صرف دو ایسی باتیں ذہن میں آتی ہیں جنھیں کہنے میں مضائقہ نہیں۔

پہلی دلچسپ بات میرے متعلق یہ ہے کہ مجھے پہلا شعر کہنے کی تحریک خود نہیں ہوئی۔ یہ بَلا میرے گلے ۱۹۴۹ء کے آغاز میں کچھ کرم فرماؤں کے کالج میگزین کے لیے نظم پر اصرار نے ڈال دی۔ یعنی میرا شعری سفر کسی شعر یا نامکمل غزل سے نہیں بلکہ ایک مکمل پابند نظم سے ہُوا جس کا ہر شعر صحیح قرار دیا گیا اور جسے من و عن کالج میگزین میں شامل کر لیا گیا اور پھر تو ؎

چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

ورنہ مجھے آج بھی یقین ہے کہ ؎

میں اگر شعر نہ کہتا تو بڑے کام کا تھا

دوسری دلچسپ بات میرے متعلق یہ ہے کہ غیر شعوری سطح پر استفادہ تو میں نے حسبِ مقدور روایت سے بھی کیا اور مختلف ادبی تحریکوں کے ادب سے بھی، لیکن نہ میں کسی روایت کا

معتقد ہو سکا، کیونکہ ہر روایت وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے، اور نہ مجھے کسی ادبی تحریک میں مَس رہا کیونکہ میری دانست میں تخلیقِ شعر ذاتی شاعرانہ وجدان و آمد کی مرہون ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ احساسات ومحسوسات سماجی تنظیم اور ماحول سے تو متاثر ہوتے ہیں لیکن انھیں کسی ادبی تحریک کا تابع کرنا ان کا گلا گھونٹنے جیسا ہے۔ (ہاں ایسی کسی تحریک سے وابستگی ناموری کا ذریعہ البتہ بن جاتی ہے اور اکثر و بیشتر کھوٹے سکّوں کو بھی خوب چلا دیتی ہے۔ اخبارات و رسائل، تعلیمی اداروں، فلمی دنیا، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ سے براہِ راست یا بالواسطہ تعلق نے بھی اکثر یہ جادُو جگایا ہے۔) میرے لیے اپنی اور اپنے عہد کی زندگی کے کچھ تجربے ہی یعنی وہ احساسات ومحسوسات ہی، جو میری شخصیت کو جھنجھوڑ جائیں، تخلیقِ شعر کا محرّک رہے ہیں۔

تجربے کے تعلق سے ایک اور بات ذہن میں آتی ہے۔ اپنی منفرد خداداد صلاحیتوں اور ان کی جداگانہ تربیت کے باعث ہر شخص کا مزاج دوسروں کے مزاج سے ایسا ہی مختلف ہوتا ہے جیسے اس کی انگلیوں کے نشان۔ اس لیے ایک ہی واقعے کا اثر ہر شخص پر اس کے ذاتی مزاج کے مطابق دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر لمحہ بدلتی ہوئی نفسیات کے باعث ایک ہی شخص پر بظاہر یکساں وارداتوں کا تاثّر ہر بار مختلف ہوتا ہے۔ یعنی کوئی تجربہ اپنے آپ کو دہراتا نہیں ہے۔ شاعر عام آدمی کی نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے اور زیادہ قوتِ غور و فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں زیادہ گہرائی اور نظر میں زیادہ وسعت ہوتی ہے، اس لیے اس کا تجربہ بھی زیادہ گہرا اور وسیع ہوتا ہے۔ اور جب شاعر کے دل و دماغ جاگ اٹھتے ہیں تو وہ بغیر کوئی سدّھی حاصل کیے زمان ومکاں کی حد سے آگے نکل جاتا ہے جہاں کائنات کی ہر واردات مطالعے میں ڈھل جاتی ہے اور خود شاعر پر گزری ہوئی معمولی واردات بھی کائناتی تجربہ بن جاتی ہے، مگر اس کے ذاتی مزاج کے منفرد اندازِ نظر سے اور اس کے شعورِ انتخاب کے مطابق۔ تجربے سے جڑا ہوا مسئلہ بیان کا، یعنی شاعر کے لیے زبان کا ہے۔ شعر چند گنے چنے لفظوں کے قالب میں نمودار ہوتا ہے۔ ایسے لفظ جو اس مفہوم کا گلا بھی گھونٹ سکتے ہیں جسے ادا کرنا ان سے مقصود ہو، مفہوم کو الجھی ہوئی پہیلی بھی بنا سکتے ہیں، مختلف مفہوم بھی پیدا کر سکتے ہیں اور منفرد احساسات ومحسوسات کی انفرادیت کو برقرار رکھنے، سطحیت کو جدّت، جدّت کو نئی جہتیں اور نئی جہتوں کو لامحدود وسعتیں عطا کرنے کی قدرت بھی انھیں لفظوں میں

ہے، تاہم اپنی تمام تر ترقی کے باوجود زبان نہایت نامکمل وسیلۂ اظہار ہے۔ چنانچہ کامیاب ترین شعر بھی شاعر کے اصل احساسات ومحسوسات کی طرف ایک مبہم اشارے سے بیش نہیں ہوتا غالباً اسی لیے کہتے ہیں کہ شعر سمجھا نہیں جاتا بلکہ محسوس کیا جاتا ہے۔

میں نے شروع میں اپنے، اپنی زندگی کے اور اپنے کلام کے متعلق کچھ کہنے سے معذوری کا اظہار کیا تھا۔ اس خامہ فرسائی کے بعد میرا اس تعلق سے کچھ کہنا شاید ضروری بھی نہیں رہا۔ کلام آپ کے سامنے ہے۔ اِسی میں مَیں اور میری زندگی چھپے ہوئے ہیں۔ ان کی قدر وقیمت کا صحیح تعیُّن کرنا آپ کا کام ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اسے دیانتداری سے سرانجام دینے میں کامیاب ہوں گے، حالانکہ مجھے اُن ناگوار قیدوبند کا بھی احساس ہے جن میں رہ کر آپ کو یہ کام کرنا ہوگا۔ مجھے تو یہ اختیار تھا کہ کسی بھی لفظ کو یا اس کے استعمال کو بدل دوں لیکن آپ کو صرف استعمال شدہ لفظوں کے پیچھے جھانک کر اُن احساسات ومحسوسات تک بھی پہنچنا ہے جنھیں بیان کرنا مجھے مقصود تھا نیز اُن کی انفرادیت کا تعیُّن بھی کرنا ہے اور اِس انفرادیت کا مرتبہ بھی طے کرنا ہے اور ایسا کرنے میں آپ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ شناخت کیے ہوئے احساسات ومحسوسات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے شعری وِجدان کے مطابق شعر کے لفظوں یا اُن کے استعمال میں ردّوبدل تجویز کردیں۔ پھر بھی مجموعی طور پر کام خاصا گناہِ بےلذّت ہے۔

بات اُدھوری رہ جائے گی اگر میں ان احباب کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی نیک خواہشوں اور اَن تھک کوششوں کے بغیر اس مختصر انتخاب کا منظرِ عام پر آنا ممکن نہ ہوتا لیکن میں تو شعر کہنے کو بھی سزا سمجھتا ہوں۔ مجھے اس مجموعے کو شائع کرنے پر مجبور کرنا ان کی سراسر زیادتی تھی ؎

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

ایسے میں شاید مناسب یہی ہے کہ ان کے نام نہ لوں۔

دوستوں سے شکوے بھی دوستی کا مسلک ہیں
لیکن ان کی رسوائی دوستی نہیں کرتی

□□□

کتاب ''ازبر'' سے جو ۲۶ر ستمبر ۱۹۸۳ء کے روز ریلیز ہوئی تھی، پیش کردہ تھے مشہور شاعر جگدیش چندر نور اور کتاب کی ترتیب وتہذیب کے فرائض رام پرکاش راہی نے انجام دیئے تھے۔ آج مصنف، پیش کردہ اور مرتب تینوں ہی نہیں ہیں مگر ''ازبر'' ہے، زندہ ہے اور برسوں تک زندہ رہے گی۔ (ادارہ)

حیرتؔ کی غزلیں اور منتخب اشعار بطور نمونۂ کلام

(۱)

خالی ہاتھ دِکھانے پہنچا گھر گھر مَیں
شاید اگلے وقتوں کا ہُوں سِکندر مَیں
جب بھی تیری ٹوہ میں نکلا باہر مَیں
خود کو پیچھے چھوڑ گیا ہوں اکثر مَیں
کس کا چہرہ جھانک کے دیکھوں اندر مَیں
خود ہی بُت ہوں، خود ہی اپنا بُت گر مَیں
کتنا خوش ہوں تیرا لمس چُرا کر مَیں
شیشہ خو، سیماب طبیعت، پتھر مَیں
کیا دُنیا میں کوئی نہیں کہنے والا؟
ایسی بات بھروسا کرلوں جس پر مَیں
اِس عالم کو اہلِ نظر کیا کہتے ہیں؟
چاہتا کچھ ہوں، کرتا کچھ ہوں اکثر میں
اَبر بنا ہوں پیاس بجھانے دھرتی کی
قطرے قطرے کا ممنون سمندر مَیں
لوگوں نے کیا کیا نہ قیاس آرائی کی
چپ تھا آج ترے آگے سے گزر کر مَیں
حیرت کس زنجیر کے ٹوٹے حلقے میں
عرش پہ تنہا چاند، اکیلا چھت پر مَیں

□□

(۲)

خواہ تغافل، خواہ توجّہ بن کر آ
گاہے گاہے آنے والے اکثر آ
نس نس میں پیوست ہلاہل باہر آ
مجھ تک کیوں محدود ہے منظر منظر آ
اور کسی صورت سے اگر ناممکن ہے
وہم ہی بن کر خستہ دِلوں کو باور آ
پھر حالات نے پہلے جیسی کروٹ لی
پھر کرتے ہیں ساگر منتھن شنکر آ
نوکِ مژہ سے آگے موت کی وادی ہے
پگھلے ہوئے غم واپس آنکھوں میں در آ
جذب و گریز احساس کے بَل پر زندہ ہیں
تو لافانی، ترک و طلب کے پیکر آ
ایک غبارہ بطنِ افق سے اُبھرا ہے
رگ رگ میں چبھتے ہوئے غم کے نشتر آ
لمحوں کی زنجیر نہیں ٹوٹی اب تک
بے خوابی کو اُس کے خواب میسّر آ
مجھ میں بھی مستانہ وار ہلورے لے
اور ابھی میرے نزدیک سمندر آ
کب تک اپنے پَروں کو باندھے رکھے گا
مجھ میں بسے آوارہ پرندے باہر آ
واقف کر سب کو آدابِ تحیّر سے
گاہے افسوں گاہے حیرت بن کر آ

□□

(۳)

غم و نشاطِ دوعالم سے ماورا سا لگا
وہ جھرّیوں سے بھرا چہرہ آئینہ سا لگا

طلسم لطف و عنایت کا ٹوٹتا سا لگا
تمہارا رُوٹھ کے جانا بڑا بھلا سا لگا

وہ کیا ہے، کیسے بتائیں، بس اِس قدر سمجھو
کبھی بدن، کبھی خوشبو، کبھی خلا سا لگا

میں جس کا نام پتہ پوچھتا رہا سب سے
وہ اجنبی تو مجھی میں چھپا ہُوا سا لگا

کوئی تو بات یقیناً تھی اُس کے چہرے میں
جسے رگوں کا لہو جھانکتا ہُوا سا لگا

یہ میرا وہم سہی لیکن ایسا وہم بھی کیا
ہر ایک شخص مجھے خود سے کچھ خفا سا لگا

جو نام وردِ زباں آج تک رہا حیرتؔ
وہ نام آج اچانک نیا نیا سا لگا

□□

(۴)

خود ہی اپنا راز خود ہی راز داں بن جاؤں گا
ایک لمحے کا یقیں ہوں پھر گماں بن جاؤں گا

حرف کی صورت زباں پر ایک بار آنے تو دو
دیکھتے ہی دیکھتے مَیں داستاں بن جاؤں گا

ابتدا میں اک علامت تھا گزرتے وقت کی
انتہا تک اگلے وقتوں کا نشاں بن جاؤں گا

جب تراشا جارہا تھا ذہن میں میرا بدن
کس نے سوچا تھا کہ مَیں سُونا مکاں بن جاؤں گا

ہوتے ہوتے وہم میں تحلیل ہوجاؤ گے تم
اور مَیں بھی ایک سعیِٔ رایئگاں بن جاؤں گا

حیرتؔ ایسا ہی مشیّت کا ہے شاید قاعدہ
جھلملاتی لَو سے اُبھرا ہوں دھواں بن جاؤں گا

□□

منتخب اشعار

اُنھیں کی بزم میں نہیں، جہاں بھی ہم گئے وہیں
نئے نئے صنم ملے، نئے نئے خدا ملے

■

بڑا گھنا ہے اندھیرا، بڑی اُداس فضا
لرز رہی ہے عجب ناگہانیوں سے ہَوا

■

بس ایک اُبھرتی ہوئی چیخ کی بھنک سی پڑی
پھر اُس کے بعد کسی نے بھی اور کچھ نہ سُنا

■

تعلّقات کو بنیادِ زندگی نہ بنا
تعلّقات بگڑتے سنورتے رہتے ہیں
اسی خیال سے شاید پکار لے کوئی
قدم قدم پہ زمانے ٹھہرتے رہتے ہیں

■

سُست گامی کے لیے صرف شبِ غم ہی ملی
گردشِ وقت بالآخر ترا منشا کیا ہے

■

اِسی کو دوستو نیرنگیِ حالات کہتے ہیں
دماغوں میں اندھیرا ہے نگاہوں میں اُجالے ہیں

■

اِس نے بھی کیا پہاڑ اٹھایا ہے درد کا
کیسی اُتھل پتھل ہے یہ دریا کی ناف میں

بیاں کیے تو لگے واقعے کہانی سے
عجیب رشتہ ہے الفاظ کا معانی سے

■

اتنا لہو لُہان تو چہرہ کبھی نہ تھا
پتھر سے بھی ہیں سخت تمہاری ہنسی کے پھول

■

اے جرأت رندانہ مایوس نہ ہو جانا
کچھ وقت ہی ایسا تھا ہم جان کے ہارے ہیں

■

کیسا رہے جو دوستو، بات مری بھی مان لو
ویسے تو خیر زندگی وہم بھی ہے گُماں بھی ہے

■

پوچھ رہے ہو میرا حال
جیسے تمہیں معلوم نہیں

■

آج تمہیں سمجھاؤ اِس کو اے شب کے اندھیارو
جانے کس کی راہ تکے ہے سُونا سُونا آنگن

■

نام جب بھی ہوا خودی کا ہُوا
کام جب آئی بیخودی آئی

■

اب کوئی رات ہے نہ دن حیرت
سر پہ کن جنگلوں کے سائے ہیں
ہر مسرّت کی اِبتدا غم سے
ہر مسرّت کی اِنتہا غم ہے

انقباضِ غمِ حیات کریں
آؤ ترکِ تعلقات کریں

■

تم کیا ساز ملاؤ گے
خود نغمہ بن جاؤ گے

■

دیوانوں کو مت چھیڑو
دیوانے کہلاؤ گے

■

ڈس لے نہ سرِ راہ کہیں یاس کی ناگن
اے میرے ارادوں کی دُلہن دیکھ کے چلنا

■

رستے میں صلیبوں کے کئی شہر پڑیں گے
ہر گام پہ ہیں دار و رسن دیکھ کے چلنا

■

ہر نظر حاملِ میخانہ تو ہوسکتی ہے
ہر نظر حاصلِ میخانہ نہیں ہے ساقی

■

دل ہے یا کوئی سیتا
زندگی ہے کہ راون

■

قرب تھا نہ بُعد تھا وصل تھا نہ ہجر تھا
خواب تھے بکھر گئے سانحے تھے ٹل گئے

■

منزلوں کے باب میں رستوں سے مت کر مشورے
منزلیں اپنے مسائل خود کیا کرتی ہیں حل

ہندوستان کا دل

(شہر دلّی)

یہ دلّی ہے
یہ پہلی بار پانڈو نے بسائی تھی
اِسے دیکھا تو دیوردھن حسد سے کھَول اُٹھا تھا
یہیں وہ شیر دل چوہان رہتا تھا
جسے آواز پر اپنا نشانہ داغنے کا کشف آتا تھا
نظام الدینؒ سے روحانیت کا درس لے کر
وجدِ خسرو نے اسی کے گیت گائے تھے
ہمایوں نے اسی کی خاک میں خود کو ملایا تھا
اِسی کے دل کی نازک دھڑکنوں کو میؔر و غالبؔ نے زباں دی تھی
یہ اپنی ذات میں اک مختصر ہندوستاں یعنی
یہ روہیلوں کی، نادر شاہ کی روندی ہوئی دلّی
اِک ایسا شہر ہے جو بارہا اُجڑا مگر جس نے
کبھی اپنی ادائے دل نوازی کو نہیں چھوڑا
اِسے تخریب کے ہَر وار نے تعمیر کا عرفان بخشا ہے
یہاں پر ظلم کرنے والا آخر منھ کی کھاتا ہے
یہ ہر وقت ایک البیلی دُلہن کی مثل
اپنی مانگ میں سِندور بھر کر منتظر رہتی ہے ہر آزردہ خاطر کی
یہاں ہر صاحبِ دل آ کے جانا بھول جاتا ہے۔

□□

رام پرکاش راہی

بلراج حیرتؔ: یار طرح دار

برسوں کی رفاقت کی سُلگتی ہوئی یادیں
پہنائے دل و ذہن میں بل کھانے لگی ہیں
اِک صحبتِ پیہم کے تبّرک کی نشانی
سوچوں پہ کُہاسے کی طرح چھانے لگی ہیں

دیکھیں جو پلٹ کر تو لگیں نقش بہ دیوار
بُرہان و دلائل سے تری پھُوٹتے اسرار
تصدیق میں توثیق تھی، توثیق میں تصدیق
کیا حُسنِ صلابت تھا ترا شیوۂ اظہار!
تکمیل تاثّر کہاں احباب کے بس میں
پر کچھ تو عیاں کردیں تری خوبیٔ کردار

دل میں جو ترے آئی تو احباب سے اپنے
کس طُرفہ عقیدت سے کبھی تُو نے کہا تھا
تو دلّی اگر جاؤ تو حیرتؔ سے بھی ملنا
یہ شخص منوّرؔ کے عزیزوں میں رہا تھا
ہم تو اب شومیٔ قسمت ہی کہیں گے
ہم دلّی میں موجود ہیں پر تُو نہیں حیرتؔ
اشکوں سے تجھے ڈھونڈیں کہ آہوں سے پکاریں
تیرا کوئی پرتَو بھی کسی سُو نہیں حیرتؔ

اب تُو نہیں لیکن تری یادوں کے سہارے
پہنائے دل و جاں یہ منوّرہ تو رہے گی
احباب کے ہونٹوں پہ ترے ذکر میں ڈھل کر
شعروں کی ترے قند مکرّر تو رہے گی
افکار و معانی سے چھلکتی ہوئی حیرت
ازبَر تری تخلیق ہے، ازبر تو رہے گی

□□

(۲) ف۔ س۔ اعجاز

سفر مدام زندگی

ف۔س۔اعجاز کا آبائی وطن دہلی ہے البتہ ان کا پشتینی سلسلہ راجستھان سے جاملتا ہے۔ان کے پرداداوہاں سے دہلی آئے تھےاور دہلی کے ہوکر رہ گئے۔

ف۔س۔اعجاز کا پیدائشی نام فیروز سلطان ہے۔اعجاز انھوں نے بطور تخلص اپنایا تھا لیکن ادبی وصحافتی کیریئر کے آغاز سے ہی وہ اپنے قلمی نام ''ف۔س۔اعجاز'' (Fe Seen Ejaz) سے موسوم ہو گئے۔ان کی تاریخ پیدائش ان کے اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق ۲رمئی ۱۹۴۸ء ہے۔اس میں سال پیدائش تو درست ہے لیکن تاریخ میں مغالطہ بتایا جاتا ہے۔ اندازہ ہے کہ ان کی پیدائش جولائی ۱۹۴۸ء کی کسی تاریخ کو ہوئی ہوگی۔

جب میں نے اعجاز کی ادبی خدمات اور فکروفن کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ان کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کرنا چاہی تو انھوں نے جواب دیا کہ اپنے حالاتِ زندگی لکھنا میرے لیے مشکل کام ہے۔میں جب اپنے بارے میں کچھ لکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو قلم دیر تک ہونٹوں میں دبائے بیٹھارہ جاتا ہوں کہ کہاں سے شروع کروں۔ایک تو میری نجی زندگی واقعاتی طور پر گنجان ہےاور پھر ظاہر ہے کہ ایک واقعہ کی کڑی دوسرے واقعہ سے جُڑی ہوتی ہے۔اس لیے بہ یک وقت اختصاراور تسلسل سے کچھ بیان کرنا دشوار ہے۔ دوسرے، میں زندگی یا ادب میں کبھی بلند بانگ نہیں رہا۔میرا اندازہ ہے کہ ایک خود پرست اپنے آپ کو زیادہ آسانی سے بیان کرسکتا ہےاوراس عمل سے اسے ایک خاص قسم کی لذت یا تسکین بھی حاصل ہوتی ہے۔چنانچہ اپنے بارے میں زیادہ کچھ لکھنے سے قاصر ہوں۔ساتھ ہی میرا یہ بھی خیال ہے کہ میرے سوانحی کوائف سے کسی کو خاص دلچسپی نہیں ہوسکتی اور نہ وہ کسی کے لیے معجونِ شباب آور یا نشے کی گولی ثابت ہوں گے۔

بہر حال میری اس تحقیقی اور فنی کاوش کی ضرورت کے تحت میرے بے حد اصرار پر ف۔س۔اعجاز نے اپنا جو مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے اور اس سے نہ صرف ان کا خاندانی پس منظر اور ان کی تگ و پو کے بنیادی مرحلے آشکارہ ہو جاتے ہیں بلکہ ذہن سازی، خوئے طبیعت اور ادبی میلانات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

(۱) بچپن اور خاندان

بچپن یاد آتے ہی وہ محرومیاں یاد آ جاتی ہیں جن میں ہم جی رہے تھے۔ میری پیدائش سے پہلے تک میرے والد، تایا، چچا اور پھوپھی اپنے والد (یعنی میرے دادا) کے ساتھ ان کے گھر میں جو سرائے خلیل، دہلی میں واقع تھا، رہا کرتے تھے۔ ایک بڑا مشترکہ خاندان تھا جس میں اس وقت میرے تایا معاشی طور پر مستحکم تھے۔

مجھے اپنے دادا مرحوم محمد عمر یاد ہیں۔ میرے بچپن میں ان کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت تھا۔ دادی سکینہ بی کب گذر چکی تھیں ہمیں نہیں معلوم۔ ہم بہن بھائیوں میں سے کسی نے انھیں نہیں دیکھا۔ یہ معلوم ہے کہ دادی اپنے چھوٹے بیٹے یعنی چچا کی ولادت کے بعد ہی انتقال فرما گئی تھیں۔ ہمارے دادا بے حد شفیق، بردبار، محنتی اور انتہائی سنجیدہ آدمی تھے۔ انھوں نے بیوی کے مر جانے کے بعد اپنی اولادوں کو باپ ماں دونوں کا پیار دیا۔ اور لوگوں کے اصرار کے باوجود دوسری شادی نہیں کی۔ دادا کے چار اولادیں تھیں۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی جن کے نام یہ ہیں: عبدالرحمٰن، محمد ابراہیم، زینت بی اور محمد اسماعیل۔ اب وہ سب پیوند خاک ہو چکے ہیں۔ پھوپھی معذور تھیں اس لیے ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں کلکتہ میں ۳/اگست ۱۹۹۵ء کو ان کا انتقال ہوا۔

محمد ابراہیم میرے والد تھے۔ والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ ہمارے نانا رحیم بخش اور نانی اللہ رکھی تھیں۔ نانا اور نانی کی پیدائش اور موت دہلی میں ہوئی۔ میں نے اپنے نانا نانی نہیں دیکھے۔ یہ معلوم ہے کہ ہمارا ننیہال مکان نمبر ۲۸۸، گلی سموسان، لال چھتہ، فراش خانہ میں واقع تھا۔ نانا کے پاس وہ پورا دو منزلہ مکان تین روپے ماہوار کرائے پر تھا۔

بچپن جہاں سے مجھے یاد آتا ہے وہ ہے حویلی حسام الدین حیدر، بلّی ماران کا مکان نمبر ۱۳۳۷ جو والد نے کسٹوڈین سے کرائے پر لے رکھا تھا۔ مرزا غالب کے مکان سے دو منٹ کی مسافت پر گلی محل سرائے کے پھاٹک کے ٹھیک سامنے ہمارے گھر کا زینہ تھا۔ نچلی منزل پر بازار بلی ماران کے کسی تاجر کا لنولیم اور ریکسن کا گودام تھا۔ پہلی منزل اور چھت ہمارے قبضے میں تھی۔ بڑا کشادہ گھر تھا جس میں ہم کھیل سکتے تھے، اچھل کود مچا سکتے تھے۔ ''ہا۔ہو'' چلا کر اپنی گونج سن سکتے تھے۔ کبوتر پال سکتے تھے، کبوتر پکڑ سکتے تھے۔ جنگلی کبوتروں نے تو ہمارے یہاں گھونسلے بنا رکھے تھے۔ کبھی کبھی تو ہم کبوتریوں کے روئی جیسے اجلے انڈے چرا لیا کرتے تھے۔ گلہریاں بہت آتی تھیں، ہم ان کی دم میں رسّی باندھنے کی کوشش کرتے۔ ایک بار ایک گلہری کی دم پھندے میں آگئی۔ بہت دنوں تک مجھے ایک جیت کا احساس رہا۔ تو تا مینا بھی ہماری چھت پر اکثر آبیٹھتے اور کبھی بندر بھی منڈیر پر آبراجمان ہوتے۔ گھر میں ہم نے کچھ خرگوش بھی پال رکھے تھے۔ کھلا آسمان، کھلی ہوا، کھلی دھوپ، راستہ کنارے کا گھر، کھلا برآمدہ، پرندوں کی بولیاں شاید تبھی سے میری کمزوری اور ضرورت بن گئیں۔ شہر میں رہتے ہوئے بھی فطرت سے ایک خاص انس پیدا ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گھپ کمرے میں مجھ سے نہیں رہا جاتا۔

میرے والد نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی فاطمہ بیگم سے ہوئی جن سے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ذکر الرحمٰن، انیس الرحمٰن، اَمَۃُ الحسین (۵/نومبر ۱۹۸۷ء)، عطاء الرحمٰن، میں اور ضیاء الرحمٰن ہوئے۔ بڑے بھائی صاحب اور بہن کی شادیاں ۱۹۵۷ء میں انجام پائیں۔ اس کے بعد ہی ابا نے دوسری شادی ایک بیوہ خدیجہ بیگم سے کی جن کے پہلے شوہر سے چار بچے تھے۔

۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء میں ہمارا خاندان دہلی سے کلکتہ منتقل ہو گیا جہاں ۱۹۵۲ء میں ابا صندوق کے لوازمات اور دیگر ہارڈ ویئر کا ایک کارخانہ قائم کر چکے تھے۔ وقت اور حالات موافق تھے۔ ان کا کاروبار اچھا چل نکلا۔ سارے ہندوستان میں اس کی دھوم ہو گئی۔ ایکسپورٹ امپورٹ بھی ہونے لگا۔

اب کلکتہ میں ابّا کے دو گھر تھے۔ دو زندگیاں تھیں۔ آدمی زندگی کی نعمتوں کو ضرب دینا چاہتا ہے لیکن وہ اسے تقسیم کرتی چلی جاتی ہے۔ خدیجہ بیگم ابّا کی زندگی میں کیا آئیں ہمارے خاندان کا نقشہ بدل گیا۔ کئی افسانے ہماری زندگی میں داخل ہو گئے جن کی کرچیں ہماری راہوں میں یوں بکھریں کہ ہمارے تلوے لہولہان ہو گئے۔ خدیجہ بیگم سے ہمارے والد کی تین اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے ظفر سلیم، انور سلیم اور ایک لڑکی روبینہ۔ تینوں ماشاء اللہ شادی شدہ اور اپنی اپنی جگہ بال بچوں سمیت خوش حال ہیں۔

باپ کی تثلیثی گھریلو زندگی کا سایہ میری ہستی پر پھیلا ہوا ہے۔ ماں پر ستم ہائے بے شمار دیکھنے کے بعد عورت ذات سے مجھے ایک خاص طرح کا پیار ہو گیا جس نے ایک حد تک مجھے عورت کی آزادی کا حامی بھی بنا دیا اور میں نے یہ سیکھا کہ مرد کو اپنی حدیں جاننا چاہئیں۔ ابّا غیر معمولی صلاحیت اور بڑے دل گردے والے انسان۔ دوستوں پر تو وہ جان نچھاور کر سکتے تھے۔ ایک قسم کے ایڈونچر اور ہیروازم کے جذبے کی گرفت میں رہا کرتے تھے جس پر لوگوں کو رشک آتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی غصے یا جذبے میں معاملات بگاڑ لیا کرتے تھے۔ پھر بعد میں پچھتاتے بھی تھے۔ ان کا المیہ بس یہ ہے کہ ناخواندہ ہونے کے سبب ان کی انا اپنے طور پر مطمئن ہونا چاہتی تھی۔ انھوں نے عمر بھر اپنے سب بیٹوں کو اپنا فرماں بردار بنائے رکھا۔ یہ بھی ان کی خوبی تھی۔ آج ان باتوں کا تجزیہ کرتا ہوں تو کنبے کے ہر کردار سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنی چھوٹی ماں سے بھی۔ اس پورے تجربے نے ثابت یہ کیا کہ عورت مجسم رحمتِ خداوندی ہے ہر چند کہ وہ مجسم غرض کی بندی بھی ہو سکتی ہے۔ ہماری ماں حد درجہ سیدھی اور ایثار مند عورت تھی۔ اس نے اپنی سوتن کو باعزت طور پر قبول کر لیا۔ یہی نہیں اس کے سابق شوہر کی اولادوں کو بھی اپنے دامنِ شفقت میں لے لیا۔ اور ہمارے والد سے جنمے ہوئے بچوں کو بھی اپنی اولادیں مان لیا اور آخر کلیجے پر کئی داغ لیے ۱۸/اکتوبر ۱۹۷۰ء کو کلکتہ میں چل بسیں۔ چھوٹی اماں کا انتقال دہلی میں دسمبر ۱۹۸۸ء میں ہوا۔ ابّا کی رحلت کلکتہ میں ۱۱/نومبر ۱۹۸۷ء کو ہوئی اور ہماری اماں کے انتقال کے سترہ سال بعد ''سولہ آنہ قبرستان'' خضر پور

میں ان ہی کی قبر میں ان کی میت اتری۔

ہمارے خاندان میں کم وبیش سبھی ہنرمند گزرے۔ لیکن اُس وقت ہمارے یہاں تعلیم اتنی ہوا کرتی تھی کہ کوئی کلامِ مجید اور اخبار پڑھ لیتا یا خط لکھ لیتا تو اسے پڑھا لکھا کہتے تھے۔ میری تعلیمی زندگی میرے اپنے مجاہدۂ نفس سے جڑی ہوئی ہے۔

(۲) تعلیم و تربیت

میری ابتدائی تعلیم دہلی میں حویلی حسام الدین حیدر میں واقع لال مسجد اور مدرسہ میں ہوئی۔ پھر چند ماہ لال کنواں گرلز اسکول (نزد ہمدرد دواخانہ لال کنواں) میں پڑھا۔ وہ اسکول دراصل لڑکیوں کے لیے تھا لیکن ۱۹۵۶ء کے وقت جب تعلیم پھیلانا نیا نیا سرکاری یا قومی مشن طے ہوا تھا، داخلے پر زیادہ پابندیاں نہیں تھیں۔ اگر کوئی لڑکی اس اسکول میں پڑھتی تو اس کے چھوٹے بھائی وغیرہ کو استثنائی طور پر ادنیٰ جماعتوں میں داخلہ دے دیا جاتا تھا۔ میری آپا (اَمتُ الحسین) چونکہ اس اسکول کی طالب علم تھیں اس لیے مجھے بھی وہاں تیسری کلاس میں داخلہ مل گیا۔ لیکن وہاں میرا دل نہیں لگا۔ جلد ہی وہاں سے اٹھ کر فتح پوری مسلم ہائی اسکول میں چوتھی جماعت میں داخلہ لے لیا۔ زیادہ دن نہیں گزرے ہوں گے کہ ۱۹۵۸ء میں کلکتہ آ گیا اور یہاں پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول میں پانچویں جماعت میں ۵۹ء میں داخلہ لے لیا۔ ۶۴ء میں اسی اسکول سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ ساتویں کلاس میں جب تھا تو ڈرل ماسٹر جناب عبدالقیوم انصاری کی کوششوں سے پہلی بار کسی اردو یا ہندی اسکول میں سینٹ جان ایمبولینس کا قیام عمل میں آیا اور میں اس کا کیڈٹ بن گیا۔ میں مغربی بنگال کا سب سے چھوٹا ایمبولینس Cadet تھا۔ اسکول کے آخری ایام میں (اور پھر اس کے بعد کالج میں بھی) N.C.C. میں بھی شرکت کر لی۔ اس سے میں منظم ہو پایا۔ نویں تک میں کوئی زیادہ اچھا طالب علم نہیں تھا۔ البتہ ۱۹۶۴ء میں میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں (تقریباً فرسٹ ڈویژن) سے پاس کیا تو پڑھنے کی امنگ بڑھ گئی۔ اس کے

بعد جب پری یونیورسٹی میں سینٹ زیویرس کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۹ء میں وہاں سے بی اے دوہرے امتیاز کے ساتھ پاس کیا تو میں کسی لائق بن چکا تھا۔ ظاہر ہے اس میں میرے کالج کے ماحول، ڈسپلن اور اساتذہ کا ہاتھ تھا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ مجھے حصول تعلیم کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔ کیوں کہ تعلیم کے تقاضوں اور مصارف سے ہمارے یہاں واقفیت عام نہیں تھی۔ ایک بات اور، ہمارے یہاں والدین کی طرف سے لڑکوں کو روپیوں پیسوں کی چھوٹ کبھی نہیں دی جاتی تھی (مبادا بگڑ جائیں)۔ ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ باپ کی مرضی پر چلیں گے۔ اس کے علاوہ انھیں کچھ بننا ہوگا تو اپنا راستہ آپ بنالیں گے جیسے پانی اپنا راستہ بنالیتا ہے۔ اس فلسفۂ تربیت کو کوئی کسی نظر سے دیکھے لیکن اس کا ایک اچھا پہلو یہ ہوتا ہے کہ لڑکے ماں باپ یا بھائی وغیرہ پر انحصار کم کرتے ہیں اور جن کا ذہن تعمیری ہوتا ہے وہ خود کفیل ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ خاندان یا باپ کے جبر سے آزاد ہو جاتے ہیں۔

آگے چل کر مجھے اپنی تعلیم کے لیے کبھی کبھی دوستوں کے حلقے میں ٹیوشن بھی کرنا پڑی جس میں اکثر میرا حق مارا گیا یعنی کئی بار میں اپنی فیس سے محروم رہا۔ پھر کچھ اور جتن کرنا پڑے۔ بی اے کے شروع سے ہی میں نے کچھ پرنٹنگ اور اسٹیشنری سپلائی کا سلسلہ شروع کردیا تھا جس سے کچھ آمدنی ہوجایا کرتی تھی۔ میرا امبیشن تو ڈاکٹر بننا تھا لیکن میں ڈاکٹر نہیں بن سکا۔ حالات نے میرا رجحان کاروبار کی طرف کردیا۔

تعلیم کو میں ایک بڑا منصب مانتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تعلیم کے بغیر دنیا میں نہ تو عدل اور بہتر انسانی اقدار کا حصول ممکن ہے اور نہ خود غرضانہ محرکات پر عبور پایا جاسکتا ہے۔ انسان کی نجات اور بریّت علم، عمل اور صحیح کردار کے بغیر ممکن نہیں۔ میں قرآن شریف کی سورۃ العصر کے مفاہیم سے بہت متاثر ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اپنے بچپن اور جوانی میں اپنے ماحول میں میں نے انوکھے تضادات کا سامنا کیا۔ لیکن تا حال اخلاقی اصولوں کو برتر سمجھا ہے بلکہ ان کا احترام کیا ہے۔ اردو ادب وصحافت کا بھاری بوجھ ناتواں کاندھوں پر اٹھانے کے باوجود بفضل خدا مسرت والم کے مزے

لیتا رہا ہوں۔ادب سے وابستگی نے مجھے صحیح معنوں میں ''دولت مند'' کبھی نہیں بننے دیا۔ ان گنت موقعوں پر محض ایک ''کتابی آدمی'' کی شرمندگی جسم و جان پر لپیٹنے کے باوجود یہ کہہ سکتا ہوں کہ بہتوں سے اچھی گذرتی آ رہی ہے۔

(۳) عملی زندگی کا آغاز

۱۹۶۹ء میں بی اے مکمل کرنے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی میں ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔کلاسیں سویرے لگتی تھیں۔اپنے بل بوتے پر کچھ بننے کی دھن تھی تو کلاسوں کے بعد معاشی تگ ودَو میں لگ جایا کرتا تھا۔تیسرے اور آخری سال میں بعض وجوہات کی بنا پر میں نے وکالت ادھوری چھوڑ دی جس کا آج افسوس ہوتا ہے۔وکالت چھوڑنے کے بعد کچھ عرصہ منتشر زندگی گزاری پھر کرائے کی ایک جگہ میں ایک انجینئرنگ کارخانہ شروع کر کے رِوِٹ (Rivet) بنانے کا کام شروع کیا۔اس کا پورا تکنیکی علم اور الکٹرو پلیٹنگ وغیرہ شوق سے سیکھا۔اس کام میں کئی نشیب وفراز دیکھے۔یہ کام ابھی تک جاری ہے گرچہ یہ صنعت اب بیمار ہو چلی ہے۔ایک چھپائی کا پریس بھی ہے جو معیاری تخلیقی نوعیت کے کاموں کے لیے شہر میں مشہور ہے۔

میری عملی زندگی کا بڑا حصہ ''جنگی'' پیمانے پر گزرا ہے۔ایک ادیب یا آرٹسٹ کو جو فراغت اور بے فکری کا ماحول میسر آنا چاہیے وہ مجھے نہیں ملا۔فرصتیں اور نجی آسائشیں تو بہت کم ملیں۔جو تھوڑے بہت موسم ہاتھ آئے بھرپور تھے اور وہ زندگی میں شادمانی اور اداسی کے رنگ بھر کر چلے گئے۔میں ان کا پیچھا نہیں کر سکا۔ذمہ داریوں نے اتنی مہلت ہی نہیں دی۔ ہاں کوئی موسم ایسا بھی نہیں آیا جس کا ذائقہ چکھنے سے محروم رہ گیا یا جس کے ایک ایک پل کا باریک مطالعہ اور مشاہدہ نہ کیا ہو۔

(۴) شادی اور بچے

۳؍جون ۱۹۷۳ء کو میری شادی میرے تایا حافظ عبدالرحمٰن صاحب کی ایک پوتی

(بنت جناب عزیز الرحمٰن و آمنہ بیگم) کے ساتھ دہلی میں ہوئی۔ گلنار بیگم سے میری منگنی میری اماں کی پسند سے ان کے ہاتھوں ۱۹۶۷ء میں انجام پائی تھی۔ لیکن افسوس ہماری شادی کے وقت وہ اس دنیا میں نہیں تھیں۔

گلنار بیگم میرے لیے قدرت کی جانب سے ایک انمول تحفہ ہیں۔ وہ دہلی کالج سے بی اے پڑھتی ہوئی آئی تھیں اور میری بہترین رفیق، غمگسار دوست، فرض شناس بیوی ہونے کے علاوہ ہمارے پورے خاندان کے دکھ سکھ شیئر کرنے والی فرد ثابت ہوئیں۔ انھیں شروع سے ادب کے مطالعہ کا شوق تھا لیکن جب دیکھا کہ ایک ادیب و شاعر سے زندگی کی ڈور بندھ گئی ہے تو اپنے شوقِ مطالعہ میں مزید وسعت پیدا کرلی۔ میری خاطر ادبی اور کلچرل پروگراموں میں بھی میرے ساتھ شریک ہو لیتی ہیں۔ ازدواجی زندگی میں باہمی اعتماد و محبت اور فہم و تدبران کی مجھ سے رفاقت کی بنیاد ہے۔

ہمارے تین بچے ہیں۔ بیٹی الفیہ ۱۰راپریل ۱۹۷۵ء کو پیدا ہوئی۔ میں تو ڈاکٹر نہیں بن سکا لیکن الفیہ نے کلکتہ یونیورسٹی سے ہومیوپیتھی کا B.H.M.S. (اب M.B.B.S. کا مساوی) کورس مکمل کر کے مجھے سرخرو کیا۔ اور اب وہ مکہ (سعودی عرب) میں اپنے شوہر اور نئے خاندان کے ساتھ پُر مسرت زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی شادی میری بڑی سالی گلزار بیگم اور میرے ہم زلف محمد صدیق صاحب دہلوی کے ہونہار فرزند عبداللہ بخش سے ہوئی ہے جو ہنرمند، محنتی، ملنسار نوجوان ہے۔ اور اپنے خاندانی بزنس واٹر پمپ مینوفیکچرنگ سے وابستہ ہے۔

۱۷راپریل ۱۹۷۶ء کو ہمارے یہاں ایک بیٹے ثاقب فیروز کی ولادت ہوئی۔ ثاقب نے میٹرک اور اس کے بعد ادیب ماہر مکمل کیا۔ اردو DTP اور گرافکس میں ثاقب نے مہارت حاصل کی ہے۔ اور ۱۹۹۴ء میں مشرقی ہندوستان میں سب سے پہلا اردو کمپیوٹر نصب کیا۔ ثاقب میاں کے تخلیقی گرافک آرٹ کی اپج "انشاء" کے عام اور خاص شماروں کے علاوہ انشاء پبلی کیشنز کی مطبوعات، اشتہارات اور پبلسٹی میٹریل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ۱۹۹۷ء میں گرافک اور کمرشیل ڈیزائننگ کا کورس کیا۔ اور ۲۰۰۰ء میں ہارڈ ویئر انجینئرنگ بھی کی۔ علاوہ

ازیں اب وہ میرے پرنٹنگ اور انجینئرنگ کے کاموں کی طرف بھی متوجہ ہو گئے ہیں۔

ثاقب کی شادی محترم صدیق بخش وگلزار بیگم کی بڑی بیٹی آسیہ سے ہوئی۔ آسیہ کی پیدائش اور بارہویں سکنڈری تک تعلیم مکہ میں ہوئی۔ ان کا ذریعہ تعلیم عربی تھا۔

ہماری تیسری اولاد بیٹی ہے جس کا نام انشاء فیروز ہے۔ اس کی پیدائش ۲۸ فروری ۱۹۷۹ء کو ہوئی۔ بہت ذہین اور محنتی طالب علم ہے۔ اس نے شری شکشایتن کالج سے اکاؤنٹنسی میں بی کام آنرز فرسٹ ڈویژن سے مکمل کیا ہے اور اس وقت چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کے آخری سال میں ہے۔

ازدواجی زندگی کا سکھ

اقوال واقتباس

- ہوا میں شادیانے بج رہے ہیں اور اس کی آہنگ کی بازگشت پیدا ہو رہی ہے جس میں دو زندگیاں شریک ہونے والی ہیں۔
- ہم ایک ساتھ جیئے اور ایک دوسرے کو پیار کرتے رہے، بدلتے ہوئے ماہ وسال میں، ہم نے ایک دوسرے کی مسرت میں شرکت کی اور ایک دوسرے کے آنسو پونچھے۔

—چارلس جفریز

- اپنی غلطیوں کا اعتراف کرو۔ بُردبار بنو، شائستہ بنو، مان جانے والے بنو۔
- کوئی مکمل نہیں ہے۔ ایک دوسرے کا نقص بھول جاؤ۔ شور مچانے والے آدمی کا خاص وصف ہوتا ہے دوسروں میں عیب تلاش کرنا اور اپنے عیب بھول جانا۔
- شادی کوئی منزل نہیں ہے۔ یہ تو ایک سفر ہے سُکھی خاندان کی جانب۔ جہاں چاروں طرف پیار کا راج ہوتا ہے۔
- ان باتوں میں دلچسپی ظاہر کرو جن میں تمہارے شریکِ حیات کو دلچسپی ہو۔
- ایک دوسرے کا سکھ بانٹ لو۔ ایک دوسرے کا دکھ محسوس کرو۔
- ایک دوسرے کی طاقت شمار کرو۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں کو نظرانداز کردو۔
- ایک پیار کا گیت جھگڑے کے بعد اس کی کچن میز پر لکھ کر رکھ دیا کرو۔
- ایک گیت محبت کا گاؤ پرانا ہو یا نیا۔ سب کا خیال ایک ہی ہے... تم اور میں۔ ابھی اور ہمیشہ۔

- بچے میاں بیوی کی محبت کو ضرب دیتے ہیں۔
- ایک دوسرے کے لیے قربانی شادی کا لازمی حصہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔
- ایک عورت سے محض اس کی خوب صورتی کے لیے بیاہ رچانا ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی خوش نما رنگ کی خاطر ایک مکان خرید لے۔
- شوہر کو لمبی رسی دو، دیکھو وہ کس طرح کودنا چاہے گا۔
- پتنی کا جنم دِن یاد رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک بار آپ وہ دن بھلا دیں۔
- جب میاں اپنی بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے تو اس کا مطلب ہے اب اس کی بینائی درست ہوگئی ہے۔
- رات کو دسترخوان پر حجت، تکرار ہرگز نہ شروع کی جائے۔ آدھا بھرا پیٹ زیادہ گرمی خارج کرتا ہے۔
- ایک وقفے سے دفتر سے گھر فون کریں اور میٹھی بے کار باتیں ایک دوسرے سے کریں۔
- شادی میں آدھے مسئلے خاموش رہنے سے حل ہو جاتے ہیں۔
- بچے شادی کا سب سے بڑا اقرار نامہ ہیں۔ انھیں جلدی پیدا کرو۔
- اس سے کہیے ''آج تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔'' اور یقین رکھیے وہ آج رات بہت لذیذ کھانا پکائے گی۔
- کبھی سسرالیوں پر تنقید مت کرو۔ (براہ کرم آپ دونوں اس پر عمل کریں۔)
- جھگڑا کرنے کے لیے دو کی ضرورت پڑتی ہے اور غلطی پر وہ ہوتا ہے جو بہت بولتا ہے۔
- مرد کا بہترین ساتھی کوئی ہے تو اس کی ہمدرد بیوی ہے۔
- جیسے کمان کے لیے ڈور ہے، اسی طرح مرد کے لیے عورت ہے۔ اگرچہ وہ اسے موڑ دیتی ہے لیکن اس کی تابع داری کرتی ہے۔ اگرچہ وہ اسے کھینچتی ہے لیکن اس کی پیروی کرتی ہے۔ ایک دوسرے کے بنا دونوں بے کار!
- عورتیں مردوں سے زیادہ عقل مند ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ جانتی کم اور سمجھتی زیادہ ہیں۔

— مقولہ: جیمس اسٹیفنس

- عورت کچھ نہیں اگر وہ مجسم ایثار اور پاکیزگی نہ ہو۔

—مہاتما گاندھی

- ایک اچھی بیوی اور صحت مرد کے بہترین ساتھی ہیں۔
- ایک اچھی بیوی ایک اچھا شوہر بناتی ہے۔

— کہاوت

- ایک عمارت بنتی ہے لکڑی کے تختوں اور پتھروں س، ٹائلوں اور ستونوں اور سامانوں سے۔ایک گھر بنتا ہے محبت کے کارناموں سے۔جو ایک ہزار برس کھڑا رہ جاتا ہے۔

—وکٹر ہیوگو

- بیوی شوہر کو دیا گیا وہ تحفہ ہے جو جنت کا خسارہ پورا کردے۔

— گوئٹے

- عورت جتنا اپنے شوہر کو چاہتی ہے، اس سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ اسے سمجھنے کی کوشش کرے۔
- شوہر جس قدر اپنی بیوی کو سمجھتا ہے اس سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ اسے پیار کرے۔
- تمام سکھی خاندان ایک جیسے لگتے ہیں۔لیکن ہر ناخوش خاندان اپنے انداز میں ناخوش ہے۔

—لیو ٹالسٹائی

- جب میری شادی نہیں ہوئی تھی تو اولاد کے بارے میں میرے چھ نظریے تھے۔اب میرے چھ بچے ہیں اور کوئی نظریہ نہیں۔

—جان ولموٹ

- مرد میدان کے لیے اور عورت آتش دان کے لیے۔مرد تلوار کے لیے اور عورت سوئی کے لیے۔مرد سر کے ساتھ اور عورت دل کے ساتھ۔مرد حکم دینے کے لیے اور عورت حکم بجالانے کے لیے۔رات خوش گزر جائے مگر دن بھی خوش گزرے تو کیا بات ہے!

—الفریڈ ٹینی سن

- مرد اپنا ارادہ رکھتا ہے لیکن عورت کی اپنی راہ ہوتی ہے۔

- بہت ساری عورتیں بہتر بیویاں بن سکتی تھیں اگر انھوں نے اپنے مردوں کو بہتر بنانے کی کوشش نہ کی ہوتی۔
- شادی ایک کتاب ہے، جس کا پہلا باب شاعری میں لکھا گیا ہے، دوسرا نثر میں۔ اور باقی جھاڑ جھپاڑ میں۔

—بیورلے نائکولز

- شادی وہ لاٹری ہے کہ اگر آپ ہار جائیں تو بھی اس کا ٹکٹ پھاڑ نہیں سکتے۔

—ہیلن رولینڈ

- شادی وہ ترکیب ہے جس کے ذریعہ ایک سبزی فروش ایک گُل فروش کا اکاؤنٹ حاصل کر بیٹھا۔ —فرانسس رود مین
- مرد مکان بناتا ہے، عورت گھر۔
- اگر غلطیاں صرف ایک طرف سے ہوتیں تو جھگڑے اتنا طول اختیار نہ کرتے۔

—لاروچے فوکڈ

- کچھ باتیں آدمی کو اپنی بیوی سے کہہ دینی چاہئیں، کچھ اپنے دوست سے اور کچھ بیٹے سے۔ یہ سب اعتماد کے ہیں لیکن اسے ہر بات ہر کسی سے نہیں کہنی چاہیے۔ —پنچ تنتر
- ایک ساتھ قہقہہ لگانے کی صلاحیت شادی کا خلاصہ ہے۔ —فرینکوئز ساکان
- ازدواجی زندگی کا بہترین حصہ لڑائیاں ہیں۔ باقی بس یونہی سا۔

—تھورنٹون وائلڈر

- جس خاندان سے تم آئے ہو وہ اتنا اہم نہیں، جتنا وہ خاندان جو اب تم سے بنے گا۔
- وہ خاندان جو ایک ساتھ عبادت کرتا ہے۔ ایک ساتھ رہتا ہے۔
- زندگی کا پہلا نصف ہمارے والدین برباد کر دیتے ہیں اور دوسرا نصف ہمارے بچے۔

—کلارینس ایس ڈیرو

- عورت شادی سے پہلے روتی ہے، مرد شادی کے بعد۔ —پولینڈ کی کہاوت
- روز ایک نیک خواہش طلاق کو دور رکھتی ہے۔

(۵) ادبی میلانات اور صحافت

ننھا تھا تبھی مجھے کہانیاں پڑھنے کا شوق ہوگیا تھا۔ بچوں کی کہانیاں اور رسالے چھٹپن میں دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ اس کے لیے دہلی پبلک لائبریری بھی جانے لگا تھا۔ وہاں بچوں کے لیے ایک گیم روم بھی تھا جس میں ایک خاتون ننھوں منوں کو کہانیاں سناتی تھی۔

کلکتہ میں ساتویں جماعت کے وقت سے جاسوسی، رومانی، تحیراتی ناول اور فلمی وادبی رسائل میں دلچسپی ہوگئی تھی۔ دسویں جماعت پاس کرتے ہی روسی ادب نے متوجہ کیا۔ اس وقت کے سبھی آئیڈیل اردو ادیب روسی ادب سے متاثر تھے اور ترقی پسند کہلاتے تھے۔

کالج کی شروعات میں مارکس، اینگلز اور لینن کا تھوڑا بہت مطالعہ کرلیا تو شعور کی آنکھیں کھلنے لگیں۔ اس وقت مغربی بنگال میں ٹریڈ یونین تحریکیں سر اٹھا رہی تھیں۔ کمیونسٹ جماعتیں زیادہ سے زیادہ منظم ہوتی جا رہی تھیں۔ نئی پیڑھی کے طلباء اور فن کار بورژوا مخالف طبیعت کے حامل ہوا کرتے تھے۔ ادب کی اساس پرولتاریت پر قائم تھی۔ اشتراکی منشور اور انسانیت نوازی سیاسی سطح پر ہم معنی سمجھے جاتے تھے۔ کلکتہ میں نکسلائٹ اور آنند مارگی تحریکوں نے نئی عمر کے لوگوں کو شدت پسند بنا دیا تھا۔

ان دنوں میں بی اے کا طالب علم تھا۔ سردیوں کی ایک شام کو نکسل وادیوں کے ''کلکتہ بند'' کے بعد کافی سنگینی پھیلی ہوئی تھی۔ میں بنیا پوکھر علاقے سے ہوتا ہوا مدر ٹریسا کے ہوم کے پاس سے گزر رہا تھا۔ ان دنوں میں نے داڑھی رکھ چھوڑی تھی جس سے تھوڑا بہت نکسلی دہشت گرد نظر آنے لگا تھا۔ میرے نزدیک دو تین بم گرے۔ پولس نے مجھے بھی نکسلی سمجھ کر اپنی گاڑی میں بیٹھا لیا۔ لیکن یہ جان کر کہ میں سینٹ زیویرس کالج کا اسٹوڈنٹ ہوں تھوڑی دیر بعد مجھے چھوڑ دیا۔ ہاں پوچھ تاچھ پوری کی اور یہ نصیحت کی کہ تم نکسلائٹ تحریک ٰمیں مت جانا۔ تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے تمہارے اندر نکسلائٹ بننے کا رجحان ہے۔

دراصل بنگال میں ثقافتی قدروں میں تو ہمیشہ ایک قسم کا توازن قائم رہا لیکن سماجی، سیاسی قدروں میں تضاد بھی کبھی کم نہ تھا۔ جب میں یونیورسٹی میں وکالت پڑھ رہا تھا اور صبح

کلاسیں لگتی تھیں ان دنوں یونیورسٹی میں اکابر انگریز اور بنگالی معلموں کے نصب شدہ مجسموں کے سر توڑ کر گرا دیے جاتے تھے۔ یہی نہیں شدت پسندوں نے دوبار چند کانگریسی یونین والوں کے سر قلم کر کے کلاسوں میں پھینک دیے تھے۔ اور وہ لاشیں ہم نے صبح اپنی کلاسوں میں پہنچ کر دیکھیں۔ ان باتوں کے اثرات نوجوان ذہن قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ اوروں کی طرح میرا جھکاؤ بھی ان فکری قوتوں کی جانب ہو گیا تھا جو سماجی تبدیلیوں کی متلاشی تھیں اور طبقاتی کشمکش کے درمیان فرد کو نئے طور پر Defice کرنا چاہتی تھیں۔

آج بھی میرا ادب اسی نہج پر ہے کیوں کہ تبدیلی کے بعد نئی تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ یہ جدلیات تبدیلی کے مفہوم اور مقدر میں شامل ہے۔ چنانچہ ادیب ہمیشہ نئی تبدیلی کی جستجو کرتا رہے گا۔ جس دن تبدیلی کی تلاش ختم ہو جائے گی ادب پر جمود طاری ہو جائے گا۔ میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنے ادب کو پروپیگنڈا نہیں بننے دیا۔ سیاسی پروپیگنڈا ادب کی زندگی مختصر کر دیتا ہے۔

تنوع پسندی فطرت کی دین ہوتی ہے۔ میرا شوقِ مطالعہ وتحریر متنوع رہا ہے۔ کلاسیکی اردو شعراء میں میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، انیسؔ، فانیؔ، اصغر گونڈوی، داغؔ حسرت موہانی، جگرؔ مرآدبادی وغیرہ بطور خاص پسند تھے۔ اقبالؔ مفکر شاعر کی حیثیت سے اپنا الگ مقام رکھتے تھے۔ جدید شعراء میں ن۔م۔ راشد، اختر الایمان اور میرا جی کو پڑھا اور پسند کیا۔ دیگر پسندیدہ شعراء میں مجازؔ، فیضؔ، فراقؔ، جذبیؔ، مخدومؔ محی الدین، عبدالحمید عدمؔ، ساحرؔ لدھیانوی، قتیلؔ شفائی، مجروحؔ سلطان پوری، کیفیؔ اعظمی، سردارؔ جعفری، شکیلؔ بدایونی، کے نام زیادہ اہم ہیں۔ نثر نگاروں میں مولانا آزاد، نیاز فتح پوری، شبلی نعمانی، رشید احمد صدیقی، مجنوں گورکھ پوری، قاضی عبدالغفار، صفیہ اختر، فراق گورکھ پوری، ظ۔ انصاری کا اسلوب دل نشیں معلوم ہوا۔ ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں میں پریم چند، منٹو، منشی فیاض علی ایڈوکیٹ، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، اے آر خاتون، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، شوکت صدیقی، ابن صفی، رامانند ساگر، نیائے شرما، رام لعل، جوگندر پال وغیرہ مجھے پسند تھے۔

روسی ادیبوں میں میکسم گورکی، ٹالسٹائی، چیخوف، گوگول، پوشکن، دوستوفسکی، میخائیل، دودھن، میخائل شولوخوف، بورس پاسٹرناک کی جو تحریریں میں نے بزبان اردو یا انگریزی میں پڑھیں مجھ پر اثر چھوڑ گئیں۔ بعد میں کئی اور روسی شعراء کا کلام پڑھا اور ان میں سے کئی بہت پسند آئے۔ لیکن رسول حز توف کی نثر اور شاعری کا میں بے حد دلدادہ ہوں۔ الگزنڈر بلاک اور افا احمد دوا کی شاعری بھی بہت اچھی لگتی ہے۔

انگریزی ادبیات کا مطالعہ کم ہی کر پایا۔ ادھر اُدھر سے تھوڑا تھوڑا کئی ادیبوں اور شاعروں کو پڑھا ضرور۔ شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، کیٹس، شیلی، جان گالزوردی، برنارڈ شا، ابراہام لنکن، رابرٹ فرسٹ، تھامس ہارڈی، چارلس ڈکنس، چارلس لیمب، والٹ وھٹمن، ٹی ایس ایلیٹ، موپاساں، پرل ایس بک نے ذہنی افق روشن کیا۔ مفکروں اور نقادوں میں سی۔ای۔ایم جوڈ، ہیزلٹ، شوپنہار، برٹرینڈ رسل کی کچھ تحریریں پڑھیں۔ ہندوستانی انگریزی ادیبوں میں ایس رادھا کرشنن، جواہر لعل نہرو، ڈی جے ایف کراکا، ہمایوں کبیر، خوشونت سنگھ وغیرہ کے مطالعہ کا موقع ملا۔

بعض انگریزی اخبارات ورسائل نے میرے شعور کو انگیز کیا۔ ان کے نام یہ ہیں: اسٹیٹمین (کلکتہ)، پیٹریاٹ، پیپلز ڈیموکریسی (مارکسی کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان)، مینسٹریم، کرنٹ، آبزرور، ہمت، کوریر، ٹائمز، لائف، ناؤ (Now) اور سوراج۔ 'سوراج' کے ایڈیٹر سی راج گوپال آچاریہ تھے۔ ان کی تحریروں اور ان کے رسالے سے میں بہت زیادہ متاثر تھا۔ وائلڈ لائف، یڈونچر، ریڈرز ڈائجسٹ اور نیشنل جیوگرافک کا بھی پرستار رہا ہوں۔ تفریحی اخبار ورسائل میں سے اسکرین، سنے اڈوانس، فلم فیئر، پکچر پوسٹ، چترا، مدر انڈیا، شمع، روبی وغیرہ بطور خاص میرے مطالعہ کا سامان ہوا کرتے تھے۔ ملّی اخباروں میں الجمعیۃ، دعوت، ریڈینس اور سیاسی اخباروں میں ''بلٹز'' پڑھا کرتا تھا۔

میری پہلی تخلیق کب شائع ہوئی اور کیا تھی یہ یاد نہیں رہا۔ غالباً کلکتہ کے ''ماہنامہ سوز'' میں ۱۹۶۵ء میں کسی غزل کے اشعار شائع ہوئے تھے۔ انہی دنوں افسانے اور مضامین لکھنے کی بھی مشق کر رہا تھا۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں اپنے بڑے بھائی عطاء الرحمٰن صاحب (جو

ان دنوں شاد تخلص فرماتے تھے) کے ساتھ ماہوار رسالہ ''فانوس ڈائجسٹ'' جاری کیا جس کا میں مینیجنگ ایڈیٹر تھا۔ اس رسالے کا آغاز بنگال کے اولین فوٹو آفسٹ جریدے اور ہندوستان کے اولین اردو ڈائجسٹ کے طور پر ہوا۔ دہلی کے بعض محقق ملک کا اولین اردو ڈائجسٹ دہلی کے کسی ڈائجسٹ کو ٹھہراتے ہیں جو غلط ہے۔ بہر حال تیرہ شمارے نکال کر اور تلخ تجربات سمیٹ کر رسالہ بند کر دینا پڑا۔ اس رسالے میں ملک کے نامور ادباء وشعراء بھی چھپتے تھے بلکہ اس سے پہلے کلکتہ کے کسی جریدے میں ملک کے صف اول کے قلم کاروں نے اس تعداد میں شرکت نہیں کی تھی۔ کسی کسی کو (طلب کرنے پر) لکھنے کا معاوضہ بھی دیا جاتا تھا جو اس وقت کے لحاظ سے بالکل مناسب تھا گرچہ ہماری بساط سے باہر تھا۔

اپنے رسالے کے لیے چھوٹا بڑا ہر کام کرنا پڑتا تھا۔ لکھنے کے علاوہ انگریزی سے ترجمہ بھی کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ان دنوں میری تحریریں اور ترجمے فرضی ناموں سے شائع ہوا کرتے تھے۔ کوئی مخصوص فرضی نام نہیں رکھ چھوڑا تھا۔ اردو صحافت میں تنوع کا ایک سوداگر صحافی سلامت علی مہدی گزرا ہے جو بہت جلد میرا قدرداں اور پھر دوست بن گیا۔ یہ واضح رہے کہ ہماری ادبی صحافت میں تنوع ڈائجسٹ رسالوں کی دین ہے۔ اور آگے چل کر ہندوستان میں اردو ڈائجسٹ صحافت کے خدوخال سلامت علی مہدی کے ذریعہ ہی واضح ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شخص اپنی بعض عادتوں کی وجہ سے کہیں مستحکم نہیں ہوسکا۔

''فانوس ڈائجسٹ'' بند ہو جانے کے بعد میں نے باضابطہ مضامین اور افسانے لکھنا شروع کیے۔ میرا پہلا طویل مضمون ''پنڈت نہرو کے گرد'' الجمعیۃ کے نہرو سے متعلق خاص شمارے میں صفحۂ اول اور صفحۂ آخر پر اہتمام سے شائع ہوا تھا جس میں ساحر لدھیانوی کی نظم ''جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے'' بھی چھپی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میرا نام کاتب نے غلطی سے ف۔س۔ اعجاز کی بجائے فیض اعجاز لکھ دیا تھا۔ لیکن جس طرح عثمان فارقلیط صاحب کی ادارت میں وہ مضمون چھپا اور اس کی پذیرائی ہوئی اس سے میرا حوصلہ بلند ہوا۔ اس کے بعد میرا ایک اور مضمون (عنوان یاد نہیں) اسی اخبار میں شائع ہوا۔ بہر حال وہ ابتدا تھی اور اس دور میں لکھا نہ تو وہ محفوظ رکھا اور نہ سب کچھ چھپوایا۔ سب اشاعت کے معیار کا

ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ محض ابتدا تھی۔ اس زمانے میں ظ۔ انصاری صاحب نے بمبئی سے بے حد خوب صورت جریدہ ''آئینہ'' نکالا۔ اس میں میری ایک نظم اہتمام سے شائع ہوئی۔ ایک افسانہ اشاعت کے لیے منظور ہوا لیکن وہ شائع ہوا یا نہیں میں اس سے بے خبر ہی رہا کیونکہ رسالہ جلد ہی بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد میرے چند افسانے ادھر ادھر چھپے جو کسی صورت میں میرے پاس محفوظ نہیں ہیں۔ گوپال متل صاحب کے قابل قدر ماہوار رسالے ''تحریک'' میں میرے دو افسانے شائع ہوئے تھے۔ ''تحریک'' کے نگراں مدیر مخمور سعیدی صاحب نے میرا ایک افسانہ ''تتلی'' تو خاص طور پر چھاپا تھا جسے بہت سراہا گیا۔ مخمور صاحب ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے ہیں۔

''فانوس ڈائجسٹ'' کے دم توڑنے کے بعد کوئی دو ڈھائی سال جم کر میں نے فلمی صحافت کی۔ اس راہ پر چل نکلنے کی تحریک مجھے خواجہ احمد عباس صاحب سے ملی تھی جن سے ملاقاتوں کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ اپنی قومی ایوارڈ یافتہ فلم ''شہر اور سپنا'' (جو کل ۹۷ ہزار روپے سے بنی تھی) کے لیے پہلی بار ڈسٹری بیوٹر کی تلاش میں اپنے چند معاون پروڈیوسروں علی سردار جعفری فلم اداکار ڈیوڈ اور سنگیت کار جے۔ پی۔ کوشک کے ہمراہ کلکتہ تشریف لائے تھے۔ گرانڈ ہوٹل میں ان کا قیام تھا۔ بعد میں کرشن چندر جی اور اختر الایمان صاحب سے بھی مختلف ملاقاتوں میں ایک اشارہ یا ترغیب ضرور ملی کہ اردو فلمی صحافت میں اوباش اور کم صلاحیت لوگ زیادہ ہیں، پڑھے لکھے نوجوان بہت کم نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس تاثر کو میں نے قبول کرتے ہوئے فلمی مضامین اور انٹرویوز کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تقریباً سال بھر شہزادہ سلیم کے فلمی ہفت روزہ ''عکاس'' کا ''مدیر بے قلم دان'' رہا۔ اس کے علاوہ بھی تھوڑے بہت تجربات ادھر ادھر سے سمیٹنے کا موقع ملا۔ کلکتہ چونکہ ہندی فلم نگری نہیں ہے اس لیے یہاں اردو فلمی صحافت فروغ نہیں پا سکتی۔ ورنہ شاید کچھ مقامی اردو شاعروں اور ادیبوں کو اس سے فیض یاب ہونے کا موقع ملتا۔ بہر حال اس سے پہلے کہ ہوٹل بازی اللہ راضی کی نوبت آتی میں نے فلمی صحافت چھوڑ دی۔ ایک چھوٹا سا دلچسپ تجربہ آخر میں یہ ہوا کہ ایس کے کپور صاحب کی بنگالی فلم ''سگینہ مہتو'' تپن سنہا کی ہدایت میں بن رہی تھی۔ فلم کے ہیرو

دلیپ کمار تھے، ہیروئن سائرہ بانو تھیں ۔ یہ دونوں بنگالی نہیں جانتے تھے۔ان کے لیے بنگالی اسکرپٹ اور مکالموں کے اردو میں ٹرانس کرپشن کا موقع سوز سکندر پوری (ایڈیٹر ''سوز'') کو ملا تھا۔سوز صاحب لاپرواہ ثابت ہوئے۔تھوڑا کام کیا اور وطن چلے گئے۔باقی کام ڈکٹیشن کے ذریعہ میں نے ''ہٹاری'' ریسٹورنٹ اور نیو تھیٹر اسٹوڈیو میں بیٹھ کر انجام دیا۔

روزنامہ ''امروز'' کے ایڈیٹر اقبال اکرامی نے ایک طنزیہ ومزاحیہ ہفت روزہ ''مابدولت'' کے نام سے ۳ر نمبر ترہٹی بازار اسٹریٹ، کلکتہ سے جاری کیا تھا جو زیادہ دن نہیں چلا۔میں اس سے بھی وابستہ رہا۔

میری صحافت کا دوسرا دور ۱۹۸۶ء میں شروع ہوا۔ جب میں نے ماہنامہ انشاء جاری کیا۔اس کے ذریعہ اردو زبان وادب کی خدمات میں نے انجام دی ہیں وہ لوگوں کے علم میں ہیں۔ یہ رسالہ سرزمین کلکتہ سے پابند اشاعت کا بہترین ریکارڈ قائم کر چکا ہے۔ لیکن کئی عملی مسائل پر عبور پانے کے لیے ۱۹۹۹ء سے اسے دوماہی کر دیا گیا ہے۔اب اس میں مواد پہلے سے زیادہ دیا جاتا ہے جس سے قارئین بہت مطمئن نظر آتے ہیں۔اچھوتے موضوعات پر کئی خاص نمبروں کے شائع ہو چکے ہیں۔

تادم تحریر میری ۹ر کتابیں شائع ہوئی ہیں اور تین منظر عام پر آنے کے لیے تیار ہیں۔کئی کتابوں پر کئی اکیڈمی ایوارڈ حاصل ہو چکے ہیں۔لیکن انعامات میرا مقصد نہیں ہیں۔ بس سر جھکائے کام کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے جس سے میں مطمئن ہوں۔

ادب کے بعد موسیقی میرا خاص شوق ہے۔مصوری سے بھی کچھ شوقیہ ناظرانہ دلچسپی رہی ہے۔

[ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کی کتاب ''ہشت پہلو فنکار'' سے ماخوذ]

کالی داس گپتا رضاؔ

غزل

خوش رو بھی تھا گل، باغ کے باہر بھی نہیں تھا
سُونگھا تو وہ کانٹے کے برابر بھی نہیں تھا

اچھا ہوا جو سُوکھ گیا آنکھ میں آنسو
بے چارے کا دھرتی پہ کوئی گھر بھی تھا

حیرت ہے کہ ہم قیدِ ہوس سے نکل آئے
دیواریں بھی اُونچی تھیں کوئی در بھی نہیں تھا

کیا جانیے کن معنوں میں الفاظ لہو روئے
کچھ زخم کے چِھل جانے کا منظر بھی نہیں تھا

کیسا تھا یہ جینے کا بھنور رم تھا کہ رَو تھی
رفتار بہت تیز تھی محور بھی نہیں تھا

شاید وہ تمنائے دل و جان کی تھی صورت
پیروں میں سکت تھی ہی نہیں، سر بھی نہیں تھا

یہ راز کھلا بعدِ رضاؔ اہلِ وطن پر
وہ لاکھ مسلمان نہ تھا، کافر بھی نہیں تھا

□□

غزل

اے رضا! درد کی راہوں سے گزرنے والی
اِک غزل ایسی پڑھو دِل میں اترنے والی

کوئی راہی نہیں، ساتھی نہیں، ہمدرد نہیں
وہ گھڑی، آ ہی گئی، جینے سے ڈرنے والی

اپنی گاگر ہی سے دو گھونٹ پلادو مجھ کو
یہ گھٹا تو نہیں دھرتی پہ اترنے والی

پیار کی آنکھ کو اشکوں ہی سے بھرنا ہوگا
یہ وہ چھاگل ہے جو جل سے نہیں بھرنے والی

کوئی تمغا، کوئی میڈل مجھے درکار نہیں
عمر اب ایسی کہاں بننے سنورنے والی

ختم جب تک نہیں ہو جاتے ادھورے سپنے
رات پلکوں پہ سویرا نہیں کرنے والی

جلد آجائے جسے ساتھ مرے آنا ہے
آخری عمر ہے اب ناو ہے بھرنے والی

□ □

غزل

اب ہم چراغ بن کے سرِ راہ جل اُٹھے
دیکھیں تو کس طرح سے بھٹکتے ہیں قافلے

جو منتظر تھے بات کے منہ دیکھتے رہے
خاموش رہ کے ہم تو بڑی بات کہہ گئے

کب منزلوں نے چومے قدم اُن کے ہمدمو!
ہر راہ رو کے ساتھ جو رہ گیر چل پڑے

جانے زباں کی بات تھی یا رنگ رُوپ کی
ہم آپ اپنے شہر میں جو اجنبی رَہے

وہ لوگ خوش نصیب تھے اپنی نگاہ میں
جو ہر کسی کے شوق کی خود داستاں بنے

معلوم جن کا نام و نشاں بھی نہیں ہمیں
ہم اُن کا شہر شہر پتہ پوچھتے پھرے

کہنے کو اِک جہاں سے اُلجھتے رہے مگر
اے درد اپنے سائے سے ڈر ڈر کے ہم جئے

□ □

غزل

دردِ دل، کچھ کھارے پانی کی، اوقاتیں رہنے دو
تنہائی میں پاس ہمارے یہ سوغاتیں رہنے دو

ماضی کی کترن باقی ہے، حال کی سیون اُدھڑی ہے
مستقبل کیسا، کیا ہوگا، اُس کی باتیں رہنے دو

کُتری کوشش، پیاسے لمحے، سیمائیں اور وادھائیں
کھٹّی میٹھی کچھ یادوں کی یہ باراتیں رہنے دو

گھِر گھِر کر بادل تو آئے، پر بن برسے لوٹ گئے
آشاؤں کے اس جگ میں سوکھی برساتیں رہنے دو

کچھ نہ کچھ تو دے کر جاؤ، جس پر میں سوچوں سمجھوں
شطرنجی چالیں رہنے دو، شہ اور ماتیں رہنے دو

جیسا بھی ہے جو کچھ بھی ہے اس کو ہی سب کچھ جانو
کورے کاغذ سامن رکھو قلم دواتیں رہنے دو

آوازیں کستے رہنا تو، نکہتؔ جگ کی عادت ہے
کیسے گزرے، کیسے بیتے، دِن اور راتیں، رہنے دو

❑ ❑

غزل

آنکھوں میں اشک لب پہ ہنسی کا گماں رہے
کس کی گلی سے آئے ہیں کچھ تو نشاں رہے
دیکھو! اُلجھ نہ جائیں سماعت سے آہٹیں
دروازے وا رکھو کہ ہوا درمیاں رہے
رشتوں کا کرب، سوچ کی انگڑائیاں، تھکن
ایسے میں دردِ دِل کا تبرک کہاں رہے
دِل خوش تھا ہونٹ کانپے مگر یہ نہ کہہ سکے
آئے ہو اِتنی دیر سے اب تک کہاں رہے
خاموشیوں کو کس نے کھنکنا سکھادیا
سازِ انا کے تار تو سب بے زباں رہے
اب کیا بتائیں کون، کہاں، کیسے کھو گیا
ہر ہر یقیں کے بھیس میں کیا کیا گماں رہے
نکہت کہیں تو دم لو، کوئی موڑ ہی سہی
کیا فرض ہے کہ تشنہ لبی جاوداں رہے

□□

عتیق اللہ

پہلی نظم: کیا کہہ رہی تھی

اس نے اک پھول میری طرف پھینک کر
کچھ کہا
کیا کہا؟
اپنی انگلی سے اک آڑا ترچھا اشارہ کیا
اس کا مطلب تھا کیا؟
سات رنگوں بھری ایک رات
—اُس کے پلو میں دامن پسارے بندھی تھی
اور
اَدھ کھلے لب سے کچھ کہہ رہی تھی...
کیا کہہ رہی تھی؟

دوسری نظم: ایک بار اور پھر جنم ہوا

پہلی بار جب تمہیں چھوا تو یوں لگا
کہ جیسے میری ماں کی گود مجھ پہ کھل گئی
پہلی بار تم نے اپنا ہاتھ پیٹھ پر رکھا
تو یوں لگا
کہ جیسے میری ماں کی شفقتوں کا دور پھر سے آ گیا
انگلیاں زبان کھولنے لگیں
رواں رواں تمہارا تاب کار لمس پا کے
توتلی زباں میں گنگنا اٹھا
سفید آگ کا نشہ ریشے ریشے میں اتر گیا
جیسے پھر تمہاری کوکھ سے مرا جنم ہوا
ایک بار اور پھر جنم ہوا!

تیسری نظم: استبعاد

دیکھنے کے لیے
کس قدر ہے زمیں کی بساط
اور کشادہ ہیں آفاق کتنے
سوچنے کے لیے کائناتیں ہزار
اور چلنے کی خاطر بھی رستے بہت

دوڑتے جایئے
دوڑتے جایئے
ختم ہوگا کہیں یہ زماں نہ مکاں
اور زمان و مکاں کی گزرگاہ پر
سینکڑوں اور کروڑوں مناظر بہر جا ملیں گے
تمہارا تعاقب کریں گے
خوب صورت، توانا بدن
سر سے پا تک دمکتے
مسکراتے ہوئے پھول جیسے بدن

ان کے پہلو بہ پہلو
کوئی آنکھ نم ناک ہوتی ہوئی بھی نظر آئے گی
ایک دو ہی نہیں بے حد و حساب
آنسوؤں میں نہاتے ہوئے پاؤ گے
قلب گاہوں کی قبروں میں
کتنے ہی اَدھ کچرے خواب
ایک دو ہی نہیں بے حد بے حساب...

چندر بھان خیال

پہلی نظم: پہاڑ کے اس پار

میں نے دیکھا پہاڑ کے اس پار
ایک بوڑھا درخت لیٹا ہے
حسرتوں کے لحاف میں لپٹا
صاحب تاج و تخت لیٹا ہے...
...گرم لو کے تھپیڑے کھاتے ہوئے
نرم پودے یوں تلملاتے ہیں
جیسے شمشیر و تیغ کے نیچے
میمنے کانپ کانپ جاتے ہیں...
...اور نازک بدن حسینائیں
پتھروں پر پسر کے بیٹھی ہیں
جان لیوا دہکتے آتش داں
اپنی رانوں پہ دھر کے بیٹھی ہیں...
...خوف سینوں میں یوں پھرے جیسے
خشک پتوں پہ کوئی سانپ چلے
جیسے شہر سکوت کے رخ پر
سرخ سورج سلگتی راکھ ملے...
...اور جنگل کی حکمرانی کو
کر رہا ہے ہر اک بشر محسوس
بھیڑیا ناچتا ہے منبر پر
نسل آدم اداس اور مایوس
ہو کے زخمی تمام رشتے اب
ایک سوکھی ندی میں بہتے ہیں
کوئی سنتا نہیں کسی کا دکھ
لوگ بس اپنا درد کہتے ہیں...
... یوں تو ہر اک مکاں کے آنگن میں
پھڑ پھڑاتی ہیں عقل کی چیلیں
لیکن اندر اندھیرے کمروں میں
جل رہی ہیں جنوں کی قندیلیں

دوسری نظم: سُنو وندھیا چل!

سنو وندھیا چل!
یوں ہی سر جھکائے کھڑے رہنا
میں جب لوٹ آؤں گا تمہاری جھولی بھر دوں گا
گرم اور سیاہ سے، سرد و سفید کر دوں گا
ارتھات ہمالہ جیسا، عظیم، زندہ و جاوید کر دوں گا
اور سنو!
ابھی بہت ساری لڑکیاں، حاملہ ہونے کی تمنا میں
سوکھتی جا رہی ہیں، میں اُدھر ہی جا رہا ہوں
تم یوں ہی رہنا، سر جھکائے اور مرجھائے
اور یوں ہی میری ہوس کاریوں پر، پردہ پڑا رہے
تمہاری طرح یہ اندھیرا ابھی کھڑا رہے...
... ہاں، اور سنو!
اُدھر —
ارتھات، جدھر میں جا رہا ہوں
بہت ہی شریف لوگ رہتے ہیں
شرافت کے سوا وہ کچھ جانتے ہی نہیں
انھیں سب کچھ سکھانا ہوگا
میرے جیسا بنانا ہوگا
تم تو جانتے ہو، میں وہی ہوں
جو تم سمجھ سکتے ہو
جو تمھیں سمجھنا چاہیے!

(ہندی نظم)

درشیہ کسی نیتا کے آنے کا

مُکتی ورما

دور دور تک قطاروں میں لٹکی
سفید سفید چادروں کا ہجوم
جو دائیں بائیں دونوں اُور سے
سڑک کو چھپائے
اپنا اِستتو لیے جھول رہی تھی
قدم قدم پر پولس و پستول
چھدم اور سا کشات
گھنگھور بادلوں میں منڈلا رہی تھی
''ماں'' جو بہت بوڑھی ہو چکی تھی
اپنے جیون میں اُس نے بھلا
اتنے پولس کہاں دیکھی تھی
وہ سکتے میں آ گئی
چلتے چلتے رُک گئی
ڈری سی، سہمی سی بوکھلائی
بول پڑی!

کیا ہو گیا بٹیا؟
کیا کوئی نیتا مر گیا ہے؟
منہ پر ہاتھ رکھ کر
کچھ نہیں ماں! کچھ نہیں
بھارت کے پردھان منتری
''مندر'' دیکھنے آ رہے ہیں
مندر! تو پولس کیوں؟
مندر میں پوجا ہو گی یا گولیاں چلیں گی
پاگل ہیں کیا لوگ!
پردھان منتری ہے تو ٹھیک ہے
ہے تو ہاڑ ماس کا پتلا ہی
یہ سب آڈمبر کیوں
اُس کے سمکش نت مستک ہونے میں
جان کا خوف کیوں
کیا وہ رکشک سے بھکشک بن گیا ہے
لگتا ہے سچ مچ کل جُگ آ گیا ہے
میں گیتا کے شبد اسمرن
نہیں کر پا رہی ہوں
تو ہی سنا، کچھ تو بتا
ارے ماں! چھوڑ گیتا اور قرآن کو
یہ ترے زمانے کے گرنتھ تھے

اس اکیسویں صدی کے پُران ہیں
میزائل، پستول، کمپیوٹر، اُڑا نیں
منٹوں میں راشٹروں کو بھشمسات
کرنے والے ٹینک
اب ستیہ کیول یہی ہے
کہ ابھی تو یہاں کھڑی ہے
اور میں یہاں ترے سمکش کھڑی ہوں
یہی اٹوٹ ساکشات ستیہ ہے

□□

گلِ نغمہ

جیلانی بانو

آفتاب احمد گاتے تھے:

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

''گلِ نغمہ کسے کہتے ممی؟'' نگی سو بار کا دوہرایا ہوا یہ سوال ایک بار ممی کے چہرے پر پھر بکھیر دیتی۔ ممی کی جھکی ہوئی آنکھوں میں ڈھونڈتی، ممی کی بے تاب انگلیوں سے کھیلنے لگتی۔ جو ہر وقت تان پورے پر جانے کس راگ کو ڈھونڈے جاتی ہیں۔

''میں کیا جانوں! آفتاب احمد کہتے تھے کسی راگ کو ساز پر ہم آہنگ کرنے کی جو کھوج ہے وہی گلِ نغمہ ہے۔'' اوشا کہیں دور دیکھنے لگی۔

''تو پھر آپ نے میرا نام ''گلِ نغمہ'' کیوں رکھا؟'' نگی یہ بات بار بار پوچھتی تھی۔ اوشا کو نگی کے اس سوال کا جواب نہیں دینا تھا۔ وہ تان پورے کو سر سے لگائے انگلیوں کو دھیرے دھیرے اس پر پھیرنے لگتی۔

''جب موہن نے آفتاب احمد کو تیری پیدائش کی خبر سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے'' موہن سے کہا ''اس لڑکی کا نام گلِ نغمہ رکھو۔''

''کیوں...؟ آفتاب انکل نے مجھے گلِ نغمہ کیوں بنا دیا...؟''

نگی اوشا کے پاس آ بیٹھی۔ تان پورے پر رکھے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا بھی ہاتھ رکھ دیا۔ اوشا نے گھبرا کے تان پورہ رکھ دیا اور اپنی بیٹی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کہیں دور چلی گئی تھی۔

''شاید وہ جانتے تھے کہ تم ساز اور آواز کو ہم آہنگ کرنے کی کھوج ہو... وہ مجھ سے بار بار کہتے تھے... ڈھونڈو... پکڑو... وہ کہتے تھے... وہ...''

اوشا کی باتیں سن کر نگی کی الجھن اور بڑھ جاتی تھی... اس کے آگے جانے کتنے اُلجھے دھاگے... دائرے... سوال، چاروں طرف بکھر جاتے تھے۔

شاید اسی لیے ممی کو میں نظر نہیں آتی... وہ مجھے بار بار پکارے جاتی ہیں۔ میں سامنے بیٹھی ہوں مگر سارے گھر میں ڈھونڈتی چلاتی ہیں اور پھر وہ تان پورہ اٹھا کر ایک جگہ بیٹھ جاتی ہیں۔ آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔ نگی اپنے کمرے میں کوئی کتاب کھول بیٹھ جاتی۔

شاید شام ہونے والی ہے۔!

مورے مندرا جھوں نہیں آئے... کون چوک بھئی موسے آلی!

شام کے بڑھتے سائے اوشا کو چاروں طرف سے گھیر لیتے اور وہ جئے جئے ونتی کے سر گنگنانے لگتی۔

نگی کے ڈیڈی موہن کو بھی اوشا کے اس موڈ پر ہنسی آتی تھی۔

وہ نگی سے کہتے تھے... ''سارے کلا کار کسی نہ کسی راگ کو کھوجتے رہتے ہیں۔ اُن کی یہ کھوج ہی کسی راگ کی پہچان بن جاتی ہے۔ کسی دیوتا کی بانی... کسی شاعر کا شعر۔ نگی کو اپنے ڈیڈی پر پیار آ جاتا... بچارے ڈیڈی... کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ممی اپنی تانوں کے ساتھ کتنی دور چلی جاتی ہیں... جیسے کسی کا پیچھا کر رہی ہوں... وہ پھر کب لوٹ کر آئیں گی...؟

اوشا کہتی تھی... ''نگی... یہ کومل سُر ہیں... ادھورے سُر... میں کومل سروں سے آگے نہیں بڑھی... مگر نگی کو ایسا لگتا ممی ایک سُر پر ٹھہر کر کسی کو پکار رہی ہیں۔

''ممی! آپ کسی راگ کو کیسے ڈھونڈتی ہیں۔ مجھے تان پورے پر گا کر سکھایئے نا۔''

نگی ممی کے پاس آ بیٹھتی۔

''ہٹ پگلی... میں ابھی تک کسی راگ کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکی۔ اِدھر اُدھر بھٹکتی ہوں۔ میں تمہیں آفتاب احمد کی غزل سناؤں۔ سن راگ کافی یہ ہے...''

اوشا کو آفتاب احمد کا کیسٹ لگانے کا بہانہ چاہیے اور پھر آفتاب کی آواز سن کر موہن بھی نیوز پیپر ایک طرف پھینک دیتا۔

راگ کافی کیا ہے؟ نگی یہ غزل آفتاب احمد سے سننے کی بجائے ممی کے چہرے پر

پڑھنے لگتی تھی۔

دیکھ دل کی زمیں لرزتی ہے   یادِ جاناں، قدم سنبھال اپنا

موہن کبھی آنکھیں بند کر کے راگ کی گہرائی میں ڈوب جاتے، کبھی ممی کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔

''اوشا تم نے آفتاب سے کچھ نہیں سیکھا۔ اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی ہو...''

اوشا جیسے اپنی سدھ بدھ کھو دیتی تھی۔ وہ آفتاب احمد کے ساتھ ساتھ گانے لگتی۔ ان کے ہر ایکشن کا ساتھ دینے پر موہن کو ہنسی آجاتی۔ نگّی کو غصہ آتا۔ وہ وہاں سے ہٹ جاتی تھی۔ ''اگر میں کسی سُر کو پکڑ لیتی تو... تو...'' اوشا سوچے جاتی تھی۔ کچن میں سبزی کاٹتے میں پھر گنگنانے لگتی۔

یادِ جاناں قدم سنبھال اپنا...

رات کو موہن اوشا کے ہاتھ سے تان پورہ چھین کر ایک طرف رکھ دیتا تھا۔ پھر اس کی گود میں لیٹ کر اوشا کی طرف یوں دیکھتا تھا جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ نگّی اپنے کمرے کی کھڑکی سے انھیں دیکھتی اور انتظار کرتی تھی کہ اب ممی ڈیڈی کے لیے کوئی پیار بھرا گیت گائیں گی۔ مگر ڈیڈی کا ہاتھ ممی کے ہاتھ میں ہے اور ممی جانے کس راگ کی کھوج میں کہیں دور چلی گئی ہیں۔

''ممی ہر وقت اتنی چپ چپ کیوں رہتی ہیں؟''

کبھی نگّی بور ہو کر ڈیڈی سے پوچھتی تھی۔

''کلاکار ہے تمہاری ممی۔ ہر وقت سنگیت کی دنیا میں کھوئی رہتی ہے۔''

نگّی بڑے غور سے اپنے ڈیڈی کو دیکھتی تھی۔ انھوں نے اپنی بیوی کو کتنے اونچے استھان پر بٹھا دیا۔

ڈیڈی ممی کی گود میں لیٹے ہیں اور ممی تان پورے پر کوئی راگ ڈھونڈ رہی ہیں۔

ممی جانے کون سے راگ کے پیچھے جا رہی ہیں۔ نگّی آنکھیں بند کر لیتی۔

بلاول... نہیں ایمن... اونہہ... اب تو شام کے سائے منڈلانے لگے ہیں اور اب ممی

سوئنی کے سُروں کو چھونے دھیرے دھیرے آگے بڑھیں تو جیسے ایک ایک کرکے چراغ بجھنے لگتے ہیں اور پھر اس بڑھتے ہوئے اندھیرے میں جیسے ممی اور ڈیڈی گم ہونے لگتے ہیں...

جیون جوت جلے...

جب اوشا نگّی کو سنگیت سکھانے بیٹھتی تھی تو نگّی بور ہو جاتی تھی۔

''ممی آپ کسی راگ کو کیسے ڈھونڈ لیتی ہیں؟''

''کہاں ڈھونڈا۔ مجھے کچھ نہیں ملتا۔ اگر وہ مل جاتا تو...تو...''

اوشا جانے کن یادوں میں گم ہو گئی۔

''وہ...! کون ممی...؟'' نگّی بڑے غور سے اوشا کی طرف دیکھتی تھی۔

''وہی...جسے ہمیشہ گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔''

اوشا جب اپنی بیٹی سے باتیں کرتی تھی، ادھوری ادھوری۔

موہن نگّی سے کہتا تھا۔

''تمہاری ممی بہت بڑی آرٹسٹ ہے۔ ہر وقت کلا کی دنیا میں گم رہتی ہے۔''

مگر ایک ٹی وی انٹرویو میں اوشا نے کہا۔

''میں تو ابھی سُر کی کھوج میں ہوں۔ اُس سے آگے نہیں بڑھی۔''

کون سا راگ...؟ کون سا سُر...؟

نگّی کو ایسا لگتا تھا ڈیڈی ممی کو ایک بڑی آرٹسٹ بنا کر کسی اونچے استھان پر ایک گڑیا کی طرف بیٹھا دینا چاہتے ہیں۔ اپنے آپ سے بہت دور...نگّی کالج کے ڈراموں میں کام کرتی تھی۔ کبھی اسے ایسا لگتا وہ کسی ڈرامے کا ایسا کریکٹر ہے جسے کسی نے پوری طرح نہیں لکھا۔

وہ ہر وقت اپنے بارے میں سوچتی ہے۔

موہن آفس سے آتا تو شراب کا گلاس تھام کر ٹی وی پر کارٹون دیکھنے لگتا۔ پھر اسے درباری کے سُر سلاتے تھے نہ بھیروئیں کی تانیں جگاتی تھیں۔ نگّی سارے گھر میں دوڑتی چلاّتی۔

''ممی کل آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے چیک اپ کے لیے۔''

''نہیں۔ میں ڈاکٹر کے پاس نہیں جاؤں گی۔'' اوشا نے غصے سے کہا۔

''آپ کتنی کمزور ہوگئی ہیں۔ کبھی آئینہ دکھاؤں آپ کو؟''

''نگّی...؟'' اوشا نے گھبرا کے اپنی بیٹی کو دیکھا۔

''تو مجھے آئینہ دکھائے گی...!''

''جانتی ہے...پھر کیا ہوگا...؟''

نگّی کو ہنسی آگئی۔ ''کیا ہوگا ممی...؟''

''میں کیسی ہوں...! کون ہوں...؟ کیا یہ سب آئینے میں نظر آجائے گا؟''

''تو پھر آپ کا انجیوگرام ہوگا۔ تب پتہ چلے گا آپ کے دل کی راہیں کیوں بند ہیں؟''

''نہیں نہیں...؟'' اوشا گھبرا کے کھڑی ہوگئی۔

''میرے دل کی راہیں کیوں بند ہیں... یہ ڈاکٹر کیا جانے...؟''

نگّی ماں کے پاس آبیٹھی۔ پیار سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''ممی... میں تو جب آئینہ دیکھتی ہوں اپنے آپ کو پہچان لیتی ہوں۔''

''نہیں... تو کیا جانے تو کون ہے...؟''

آج اوشا کی یہ بات سن کر نگّی گھبرا گئی۔ وہ ماں کے پاس سرک کر آئی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر بولی۔

''بتاؤ نہ ممی میں کون ہوں...؟''

اوشا نے اپنے ٹھنڈے ہاتھوں سے نگّی کے گرم ہاتھ تھام لیے اور پھر دھیرے دھیرے جیسے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی۔

''یہ تو میں بھی نہیں جانتی تجھے کس راگ کی کھوج نے جنم دیا ہے۔ آفتاب احمد کہتے تھے... آفتاب احمد...''

آفتاب احمد کا نام آتے ہی نگّی اوشا کو دیکھنے لگی۔

''ممی! آپ کو بچپن سے سنگیت سیکھنے کا شوق تھا...؟''

''ہاں... میرے نانا پنڈت شنکر آچاریہ اندور گھرانے کے مشہور گائک تھے۔ انھوں نے میری ماتا جی کو سنگیت سکھائی اور میں کالج کے بعد سنگیت سیکھنے پنڈت ہری گوپال

کے گھر جاتی تھی۔''

''ہونہہ...'' نگّی ممی کی بات سننے کی بجائے انھیں دیکھے جا رہی تھی۔

اوشا پرانی یادوں میں کھو گئی...

''سارے کالج کے فیسٹول میں موہن بھی اپنے ممی ڈیڈی کے ساتھ آئے تھے۔اس دن میں نے جئے جئے ونتی کا راگ گایا تھا... موئے مندرا جھوں نہیں آئے... کون چوک جلی مو سے آلی...

موہن کو میرا گیت بہت اچھا لگا تھا۔

''صرف گیت؟'' نگّی نے ہنس کر اوشا کی طرف دیکھا۔

''ہٹ... شریر کہیں کی...'' اوشا شرما گئی۔

''تو پھر شادی کے بعد تو ڈیڈی دن رات آپ سے گیت سنتے ہوں گے...؟''

''نہیں...'' اوشا اداس ہو گئی۔

''ہمارے بیاہ کو چار مہینے بھی نہیں ہوئے تھے، تمہارے ڈیڈی کو شکاگو یونیورسٹی کا ایک اسکالرشپ مل گیا۔انھیں ایک برس کے لیے امریکہ جانا تھا۔''

نگّی کو ممی کا اداس چہرہ دیکھ کر اچھا نہ لگا۔

''تو پھر آپ میرا بائی کے بھجن گانے لگیں ڈیڈی کی یاد میں...''

''ہٹ... شریر کہیں کی...'' اوشا نے بڑے پیار سے نگّی کو ڈھکیل دیا۔

''میرے ڈیڈی اس وقت پاکستان کے انڈین کونسلیٹ میں فرسٹ سکریٹری تھے'' اوشا پرانی یادوں میں کھو گئی۔

''موہن نے کہا تم بھی ان کے ساتھ ایک برس کے لیے پاکستان چلی جاؤ۔''

''نہیں... مجھے پاکستان اچھا نہیں لگتا۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔''

''وہاں بھی بہت اچھے گانے والے ہیں۔ عابدہ پروین، غلام علی، مہدی حسن اور آفتاب احمد...''

''آفتاب احمد...؟'' اوشا یہ نام سن کر چونک پڑی تھی۔

اسے آفتاب احمد بہت پسند تھے۔ جب وہ ٹی وی پر گاتے تھے تو وہ انھیں دیکھنے جاتی۔ ان کی گائی ہوئی غزلوں کے کیسٹس وہ بار بار سنتی تھی۔

''آفتاب تو میرا دوست ہے، میرا کلاس فیلو تھا۔ پھر پاکستان چلا گیا۔ اب تو بہت بڑا موسیقی کار بن گیا ہے۔ میں اسے فون کر دوں گا۔ تم اس سے غزل گانا سیکھ لینا۔''

''تو آپ پاکستان چلی گئیں...؟''

نکّی کی آواز پر اوشا جانے کہاں سے لوٹ آئی۔

اوشا جب نکّی کو یہ کہانی سناتی تھی نکّی اس کے چہرہ پر آتے جاتے رنگ اندھیرے اجالوں کی پرچھائیوں میں جانے کیا ڈھونڈتی تھی۔

''ممی... بولیے نا... پھر کیا ہوا...''

اوشا چونک پڑی... نکّی کو یوں دیکھنے لگی جیسے کسی اجنبی چہرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

''پھر موہن نے آفتاب کو فون کیا۔ میں نے آفتاب کی آواز سننے کے لیے کارڈلیس فون اٹھا لیا تھا۔ دونوں ہنسی مذاق کرنے لگے۔

آفتاب موہن سے کہہ رہے تھے۔

''یار سمجھ میں نہیں آتا باوا آدم کو اپنے ساتھ حوّا کو دنیا میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''سچ کہہ رہے ہو آفتاب۔'' موہن کو ہنسی آ گئی۔

''دنیا کو سنوارنے کی اسکیم تو دھری رہ گئی اور عورت کو سمجھنے کی کھوج میں آج تک لگے ہوئے ہیں۔''

پھر موہن نے انھیں ڈانٹ دیا۔

''مگر تم کسی عورت کے چکر میں پڑ کر غزل گانا مت بھول جانا۔''

موہن نے میرے دِل کی بات کہہ دی تھی آفتاب سے۔ مگر وہ موہن کی بات سن کر اداس ہو گئے تھے۔

''موہن یار میری زندگی میں تو ہر عورت نے زہر گھولا ہے... میری سوتیلی ماں تھی۔ پھر بے وفا محبوبہ ملی۔ پھر اتنی عقل مند بیوی ملی جو مجھ جیسے لاپروا انسان سے دور چلی گئی...''

''ہاہاہا'' دونوں مل کر زور زور سے ہنسنے لگے۔

مگر اوشا نے بڑے دکھ کے ساتھ فون رکھا تھا۔ بچارا... اتنا بڑا فن کار اور کسی عورت کا پیار بھی نہیں ملا۔

رات کو وہ موہن کے پاس لیٹی تو آفتاب کا ذکر بیچ میں آ گیا۔

''اتنا بڑا کلاکار ہے اور بچارے کو کسی عورت کا پیار بھی نہیں ملا'' اوشا نے بڑے دکھ سے کہا۔

''یہ کلاکار لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں'' موہن نے لاپروائی سے کہا۔

''رومانس تو چلتے ہی رہتے ہیں مگر شادی ہمیشہ بے وقوف عورت سے کرنا چاہتے ہیں۔''

''اچھا... تو اس لیے تم نے مجھے پسند کیا تھا...!'' اوشا روٹھ گئی۔

موہن کو ہنسی آ گئی... ''اگر تم بے قوف نہ ہوتیں تو میرے جیسے ایک سائنٹسٹ سے بیاہ کیوں کرتیں۔ اتنی بڑی آرٹسٹ ہو۔ پبلک ٹکٹ لے کر تمہارا گانا سننے آتی ہے۔ تمہیں تو آفتاب جیسے کسی کلاکار سے بیاہ کرنا تھا۔''

''چھی...'' اوشا نے آفتاب کے نام کو بھی جسے دور ہٹا دیا تھا۔

''ان کلاکاروں کے ساتھ کوئی عورت جیون گزار سکتی ہے۔ ہر آن ان کا موڈ بدلتا رہا ہے۔''

''میڈم جی... مگر ایک بچارہ ہر آن موڈ بدلنے والی کلاکار کے ساتھ جیون بتا رہا ہے۔''

موہن نے اوشا کی پیار بھری مار سے بچنے کے لیے چادر میں منہ چھپا لیا۔

''آفتاب احمد جانے کیسا ہوگا... اتنا بڑا فن کار، شاید مجھ سے بات بھی نہ کرے۔''

''بہت ہینڈسم ہے۔ بڑا ہنس مکھ۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہیں غزل گانا سکھا دے۔''

کیا...؟ اوشا خوشی کے مارے رات بھر نہ سو نہ سکی۔ خواب میں بار بار آفتاب احمد اس کی طرف دیکھ دیکھ کر گنگنا رہے تھے۔

''تو پھر آپ آفتاب احمد سے ملیں...؟'' نگی اوشا کے سامنے پانوں پھیلا کر بیٹھ گئی۔

''ہم اسلام آباد گئے تو ڈیڈی نے مجھے ڈانٹ دیا۔

''پاکستان میں انڈین کونسلیٹ کا کوئی آدمی وقت لیے بغیر کسی سے نہیں مل سکتا۔''

''اور پھر تم! ایک پاکستانی گانے والے کے گھر جاؤ گی...؟''

پھر میں نے آفتاب احمد کو فون کیا۔ رات کو ان کا کوئی کنسرٹ تھا۔ انھوں نے ہم سب کو وہاں بلایا... ہم گئے تو پورا ہال بھر چکا تھا۔ پھر آفتاب احمد آئے۔ شلوار سوٹ پہنے۔ منہ پر بال بکھرے ہوئے۔''

''ممی آفتاب انکل ہر وقت ہنستے رہتے ہیں نا۔ غزل گاتے وقت بھی مسکراتے ہیں۔''

''نگی کو آفتاب کے چہرے پر آنے جانے والا ہر موڈ یاد تھا۔

''جب وہ کوئی اچھا شعر گاتے ہیں نا تو بس جیسے سننے والے کی طرف ہی دیکھے جاتے ہیں۔ چھی... مجھے تو شرم آتی تھی جب وہ... وہ...''

اوشا جانے کیا کیا یاد کرتے کرتے کہاں پہنچ گئی...

''طبلے والا اُن کی تانوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش میں سارے بدن سے کانپ رہا تھا اور سارنگی بجانے والا تو جیسے راگ کافی کے سُروں کو ڈھونڈتا میرے ساتھ ساتھ کہیں دور چلا گیا تھا...''

گانا ختم ہوا تو آفتاب پر پھولوں اور نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ انھوں نے سب کو جھک جھک کر سلام کیا اور ڈائس سے یوں غائب ہو گئے جیسے کوئی رنگین خواب... مجھے کافی کے اداس سُروں نے گھیر لیا تھا۔

دیکھ دل کی زمیں لرزتی ہے... یادِ جاناں قدم سنبھال اپنا

''اٹھو... چلو...، ممی نے مجھے پکڑ کے اٹھایا تھا۔

''ممی ڈائس کے پیچھے چلئے نا۔ آفتاب احمد سے ملیں گے۔''

''نہیں...'' ڈیڈی نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ''تم ایک گانے والے سے ملنے جاؤ گی...؟''

دوسرے دن آفتاب احمد نے مجھے اپنے گھر بلایا۔

''کیسا تھا ان کا گھر...؟'' نگی آج بڑے غور سے یہ کہانی سن رہی تھی۔

''موہن ٹھیک کہتے تھے کہ وہ بڑا من موجی آرٹسٹ ہے۔ اسی لیے بیوی چھوڑ کر چلی

گئی۔ اتنے شاندار گھر میں وہ تو اکیلا تھا۔ سارا گھر نوکروں اور دوستوں سے بھرا رہتا۔ آفتاب صبح ریاض کرنے سے پہلے پیتے تھے۔گانے کے بعد۔دوستوں سے اچھی باتیں کرنا ہوں تو کہتے تھے، بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔

جب اپنے دکھوں کو یاد کر کے روتے تھے تو کانپتے ہاتھ میں گلاس اٹھا لیتے۔

''پھر ڈیڈی نے مجھے ان سے گانا سیکھنے کی اجازت دی۔''

نگی سے باتیں کرتے کرتے اوشا کہیں دور چلی گئی...

آفتاب احمد تان پورہ سنبھالتے اور اوشا اپنے آپ کو سنبھالتی۔

وہ اوشا کے پاس آکر بیٹھ جاتے۔تان پورے پر رکھی ہوئی اوشا کی انگلیوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر پوزیشن ٹھیک کرتے۔''گاؤ...شروع کرو...''

اوشا گھبرا کے ان کے چہرے پر سُر ڈھونڈنے لگتی تھی۔ان کی تاب انگلیاں تان پورے پر کسی راگ کی کھوج میں کانپنے لگتی تھیں۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز

وہ اس مصرعے کو طرح طرح سے گاتے۔اپنے ساتھ آواز ملانے کو کہتے۔

''گل نغمہ کسے کہتے ہیں۔جانتی ہیں آپ...''

کسی راگ کو ساز سے ہم آہنگ کرنے کی جو کھوج ہے وہی گل نغمہ ہے۔پھر ان کا ہاتھ اوشا کے ہاتھ پر آجاتا...دونوں ساتھ ساتھ راگ کی طرف بڑھے۔

دھیرے دھیرے اوشا کی آواز دور کہیں چلی جاتی۔وہ آفتاب کے چہرے پر سُر ڈھونڈنے لگتی اور آفتاب کی بے تاب انگلیاں جانے کس راگ کی کھوج میں کہاں چلی جاتی تھیں۔

پھر فون کی بیل سن کر آفتاب چونک پڑے تھے۔

''ہیلو...موہن...؟امریکہ سے بول رہے ہو...؟اوشا بہت اچھی ہے۔''

(اوشا اشارہ کر کے کہتی کہ موہن کو مت بتاؤ میں یہاں ہوں)

''میں تو چاہتا ہوں اسے غزل گانا سکھاؤں۔مگر ابھی تو مجھے اس سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔اچھا اب ایک اچھی بات سنو۔ہم دونوں کے ساتھ ساتھ گائے ہوئے کیسٹس مارکیٹ

میں آ گئے ہیں۔ تمہاری اوشا کی آواز پاکستان میں گونج رہی ہے۔''

''ممی...ممی...! کیا آپ کو نیند آ رہی ہے...؟''

نگی اوشا کو جگا رہی تھی۔ جیسے آج اوشا ادھوری بات کر کے سو گئی تو نگی پھر کبھی نہ سو سکے گی۔

''مجھے بتایئے نا آفتاب انکل آپ کو سنگیت کیسے سکھاتے تھے۔''

اوشا چونک پڑتی...چاروں طرف دیکھتی اور پھر نگی کو پہچان کو دھیرے دھیرے کہتی۔

''وہ کہتے تھے راگ تو سے اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ جب ایک برہن گھورا اندھیاری میں اپنے پریتم کو پکارتی ہے تو پھر بھیروئیں کے سُر سورج کو ڈھونڈ نکالتے ہیں...اور گھور اندھیاری میں کیدار کے سُر بکھر جائیں تو اُس کا پیا چاند بن کر آکاش پر چمکنے لگتا ہے۔''

''پھر وہ آپ کے استاد بن گئے...؟'' نگی خوشی سے بولی۔

اوشا جانے کہاں چلی گئی تھی....بہت دور سے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''انھوں نے مجھے سمجھایا تھا...کبھی ہم راگ کی ترتیب بدل دیتے ہیں۔''

آروہ کا مطلب ہے سُروں کا ایک جگہ سے دوسری طرف جانا اور آورہی میں پہلے مقام سے پھر اُسی طرف لوٹ جانا۔ جب تم ساتویں سُر پر پہنچوں گی تو ''نی''، ''نکھاد'' پر راگ پورا ہو جائے گا۔''

اوشا آفتاب کی طرف دیکھے جاتی تھی۔

اس نے پانچ برس تک سنگیت سیکھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ راگ تو من کی پکار ہیں انھیں گانے والا سرگم میں باندھ لیتا ہے۔

''تم ہمیشہ نکھاد تک پہنچتے پہنچتے کیوں رک جاتی ہو...'' آفتاب احمد جھنجھلا کر کہتے۔

''گاؤ...گاؤ نا اوشا...'' وہ اوشا کی طرف جھک جاتے۔

درتانا دیرے نادیم دیم تانانا۔

وہ آفتاب کے جھے ہوئے چہرے کو ہٹا دیتی تھی...

''نہیں...میں آخری سُروں کو چھونا نہیں چاہتی...پھر کیا ہوگا...؟''

آپ مجھے لوٹ جانے کے لیے کہیں گے آروہ کی طرف...وہ بے بسی سے ان کی

طرف دیکھتی تھی۔ مگر آفتاب اس کا ہاتھ تھام لیتے۔ ہارمونیم پر انگلیاں رکھ کر کہتے۔ اور پھر ان کی انگلیاں میرے من کے کسی ساز پر چلی جاتی تھی۔

''ابھی تو جانے کتنے مقام ہیں جہاں نہیں ٹھہرنا ہے۔ سُر کو اونچا لے جانا ہے۔

الاپ... تکرار... بیلا دے... اور پھر اسی سُر کی طرف لوٹ آنا۔''

''پھر کیا ہوا ممی...؟''

''پھر تمہارے ڈیڈی شکاگو سے اسلام آباد آئے۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کو۔''

''جب ہم آخری بار آفتاب احمد سے ملنے گئے تو موہن نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا

''اب جلدی چلو۔ فلائٹ کا ٹائم ہو گیا۔''

میں جھٹ اس جگہ سے اٹھ گئی جہاں بیٹھنے کے لیے میں نے جانے کتنا سوچ بچار کیا تھا۔''

اس دن آفتاب اور موہن پیتے رہے۔ ایئر پورٹ پر آفتاب کانپ رہے تھے۔ انھوں نے مجھے موہن کی طرف ڈھکیل دیا۔

''تمہاری بیوی تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ اس کا ہاتھ تھام لو۔''

مگر موہن نے میرا ہاتھ نہیں تھاما۔ میں آج تک ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی ہوں۔ جب ہم ڈپارچر کیبن کی طرف جانے لگے تو آفتاب نے پکار کے کہا۔

''موہن... ذرا ٹھہرو... ایک بات سن لو۔''

ہم دونوں پلٹ آئے۔

''کہو... کیا کہنا چاہتے ہو'' موہن نے جھنجھلا کر پوچھا۔

''وہ... وہ... جاو... جاو...'' اپنے کانپتے ہاتھ کو اٹھا کر انھوں نے کہا۔

''شراب نے تباہ کر دیا ہے اس شخص کو۔'' موہن نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا۔

''صرف شراب نے؟'' مگر میں نے یہ بات موہن سے نہیں کہی۔

''ممی... آپ کو یہ سب باتیں ابھی تک یاد ہیں۔'' نگی بڑی محبت سے اوشا کی گود میں لیٹ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

''اٹھارہ برس ہو گئے...'' اوشا نے دور کہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اُسی سال تو پیدا ہوئی تھی۔''

''آپ پاکستان سے کب آئی تھیں۔ کس مہینے میں...؟'' اب نکّی اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔

''جنوری میں۔''

''اور میں کب پیدا ہوئی تھی؟''

''اگست میں۔ تجھے اپنی برتھ ڈے یاد نہیں ہے کیا...؟''

''تمہارے ڈیڈی کے دل میں بھی یہ شک تھا۔'' اوشا نے نکّی کا ٹھنڈا ہاتھ تھام لیا۔

''اور آپ کو...؟'' نکّی نے اوشا کا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔

''میں تو کسی راگ کی کھوج میں بھٹک رہی تھی۔ ابھی بہت سے مقام تھے جہاں سُر کو اوپر لے جاتے ہیں۔ الاپ، بیلادے، الاہنے... میں پھر اُس کی طرف نہیں لوٹی۔ نِکھاد۔ جہاں ساتوں سُر ختم ہو جاتے ہیں...

نکّی نے دیکھا... ممی آخری سُر کے پیچھے پیچھے جا رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔

مگر اوشا سوئی نہیں تھی۔ اس کے چاروں طرف جانے کتنے اندھیرے اجالے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ایک بار آدھی رات کو فون کی بیل سن کر اوشا جاگ گئی۔

موہن گہری نیند میں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا۔

''ہیلو... اوشا...! میں ہوں... میں... میں...''

''ہاں ہاں... تم ہو... کہو کیا بات ہے...؟''

''اوشا میں وہ سُر بھول گیا ہوں۔ آج اُسے گنگنانے کو جی چاہ رہا ہے۔ کون سا شعر تھا؟''

''دھیان کے آتش دان میں ناصر
پچھلے دنوں کا ڈھیر پڑا ہے''

اوشا نے شعر سنا کر فون رکھ دیا۔ یہ غزل آفتاب نے کبھی نہیں گائی تھی۔ وہ اس وقت مجھ سے کوئی شعر سننا چاہتا تھا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ موہن گہری نیند سو رہا تھا۔

موہن صبح اُٹھا تو جیسے جاگا ہی نہیں تھا۔ سویا سویا... کھویا کھویا...

ایک بار آفتاب انکل کا فون میں نے اٹھایا تھا۔ نگّی آہستہ سے بولی۔

''اچھا؟'' اوشا نے تعجب سے پوچھا۔

وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔ ''تم گل نغمہ ہو؟'' میں نے کہا ''اسے تو میں ہی ڈھونڈ رہی ہوں انکل۔ مجھے بتایئے کہاں ملے گی وہ؟'' آفتاب انکل چپ ہو گئے۔ پھر آہستہ سے بولے ''جانے کون سا وقت تھا وہ... جانے کون سا راگ تھا وہ...''

نگّی کی بات سن کر اوشا کچھ نہ بولی۔

شام کے سائے ان کی طرف بڑھتے گئے۔ نگّی جانتی تھی اب ممی تان پورہ تھام کر اپنی آنکھیں بند کرلیں گی اور سوہنی کے اداس سُر انھیں اندھیرے میں گم کردیں گے۔ جیون جوت جلے...

''ممی... پاکستان چلونا۔ آفتاب انکل سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔''

اوشا چونک پڑی...

''کیوں...؟ تو آفتاب احمد کو کیوں دیکھنا چاہتی ہے...؟''

''ممی... بات یہ ہے کہ...'' نگّی بے بسی سے ہاتھ ملنے لگی۔

''میں انھیں دیکھ لوں گی تب ہی تو پتہ چلے گا کہ میں ان سے کیوں ملنا چاہتی تھی؟''

اوشا ڈر گئی... نگّی ایک سی آئی ڈی انسپکٹر کی طرح اس کے چہرے پر کسی جرم کا سراغ ڈھونڈ رہی تھی۔

موہن نے نگّی کی بات سُنی تو جھٹ پاکستان جانے کو تیار ہو گیا۔

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔'' اوشا نے گھبرا کے کہا۔

''کیوں؟'' موہن بولا... ''چلو تفریح کریں گے۔ آفتاب سے ملیں گے۔ اس سے غزلیں سنیں گے۔''

''نہیں نہیں... بہت بکھیڑا ہے میرے لیے۔ یہاں کیا چھوڑوں۔ وہاں سے کیا لاؤں۔''

''ہم یہاں سے گل نغمہ لے جائیں گے۔ اور وہاں سے آفتاب کی آواز لے آئیں گے۔''

مگر اچانک دونوں ملکوں کے بیچ لڑائی کا شور مچ گیا... راستے بند...

دونوں ملکوں کے لیڈروں نے اپنے میزائلز ایک دوسرے کے سامنے کر دیا۔
''آفتاب، یار... ہم نہیں آسکتے... تم نے اپنے مزائلز کا رخ ہماری طرف کر دیا ہے۔''
''نہیں... ہم اپنے مزائلز کا رخ اس طرف کیسے کر سکتے ہیں یار جہاں گل نغمہ سو رہی ہے۔ اوشا سے کہو اہیر بھیرو شروع کر دے۔ مزائلز کے دھماکے سنائی نہیں دیں گے پھر...''
''چھوڑو یار یہ فضول باتیں...'' موہن نے جھنجھلا کر کہا۔
''تم اپنے آپ کو تان سین سمجھ رہے ہو کہ میگھ ملہار گا کر جنگ کے شعلے بجھا دو گے...!''
''ہم فن کار لوگ جنگ کی آگ کیسے ٹھنڈی کریں گے۔ یہ بعد میں بتائیں گے۔''
''تم جلدی سے اپنا ٹی وی آن کرو۔ لاہور سے میرا پروگرام ہو رہا ہے۔''
نکّی نے جلدی سے اپنی ٹی وی آن کیا۔
آفتاب احمد ہاتھ اُٹھا کر، آنکھیں بند کر کے اہیر بھیرو شروع کر رہے تھے۔

ایک پتھر جو دستِ یار میں ہے
پھول بننے کے انتظار میں ہے

[بشکریہ: ''نیا ورق'']

⊙⊙

ڈاکٹر بانو سرتاج
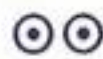
پکار

میں اکثر سوچا کرتی کہ بھائی جان کو اس مغنّیہ کے گیت اتنے پسند کیوں ہیں؟ بھائی جان ہمیشہ کہا کرتے — صرف غیر فلمی گیت سنا کرو، جب کہ میں ریڈیو اور گراموفون پر ہر قسم کے گیت سننا پسند کرتی۔ اس پر ہم میں ہمیشہ جھڑپ ہوتی۔ بھائی جان کو بس ایک آواز پسند تھی۔ وہ چاہتے کہ میں بھی اسی مغنّیہ کے نغمے پسند کروں۔

''کیوں؟ آخر آپ مجھ پر اپنی پسند، اپنی خواہش کیوں لادنا چاہتے ہیں؟'' میں ضد پر اُتر آئی۔

''ایک نہ ایک دن تم قائل ہو جاؤ گی۔'' بھائی جان مختصر سا جواب دے کر دوبارہ نغمے میں گم ہو جاتے۔

ایک روز میرے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا۔ میں بھائی جان کے پیچھے پڑ گئی — ''بھائی جان، میں اب بڑی ہو گئی ہوں۔ کیا اب بھی مجھے نہ بتایئے گا کہ آپ کی پسندیدگی کا راز کیا ہے؟''

''سعدیہ! میری بہن! اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔ یہ گیت ختم ہونے دو۔''

میں مصنوعی ناراضگی سے دور جا بیٹھی۔ بھائی جان نے گیت ختم ہونے پر پھر وہی ریکارڈ لگا دیا۔ پھر میرے قریب آ کر پوچھا ''سچ کہو سعدیہ کیا یہ آواز تمھیں پسند نہیں؟''

''میں نے کب کہا کہ آواز اچھی نہیں لیکن آپ تو دیوانے ہیں اس آواز کے۔ پچھلی مرتبہ ریکارڈ لائے تو تمام ریکارڈ اسی کے۔ کیا کوئی اور گلوکار آپ کو متاثر نہیں کرتا؟''

بھائی جان روکھی ہنسی ہنس دیے۔ ''اچھا میری خاطر غور سے اس گیت کو سنو۔ کیا محسوس ہوتا ہے؟''

میں گیت سننے لگی۔ کھو گئی آواز کی مٹھاس میں۔ میرا دل چاہنے لگا کہ گیت کبھی ختم نہ ہو۔ ''بھائی جان! کتنا درد ہے اس آواز میں! ایک انجانا درد، جو دل کو کھینچے لیے جا رہا ہے۔''

''سعدیہ! تمھیں امی کی یاد ہے؟'' بھائی جان اچانک پوچھ بیٹھے۔ میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔ کہا ''آپ ہی تو کہتے ہیں کہ امّی کے انتقال کے وقت میں صرف سات ماہ کی تھی۔'' کہتے کہتے میرا گلا بھر آیا۔

بھائی جان نے آگے بڑھ کر میرے آنسو خشک کیے۔ کہا "سعدیہ! مجھے بھی امّی کی دھندلی دھندلی یاد ہے۔ جانتی ہو، میں اس آواز کو اسی لیے پسند کرتا ہوں کہ اس میں ممتا کی پکار ہے۔ ماں کے دل کا درد الفاظ میں بولتا ہے، جسے وہی سمجھ سکتے ہیں جو ممتا سے محروم ہیں ہمیں اللہ تعالیٰ نے اُس نعمت سے محروم کیا ہے۔ جس کا بدل اس دنیا میں تو کیا، دوسری دنیا میں بھی ممکن نہیں۔ آؤ تمہیں اس مغنّیہ کی، ایک ماں کی مجبوری کی کہانی سناتا ہوں۔"

میں نے آتش دان میں آگ تیز کر دی۔ بھیّا میرے نزدیک بیٹھ گئے۔ "ممتاز بیگم اس مغنّیہ کا نام ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے گانو کی رہنے والی تھی۔ ایک دن گانو میں ایک پردیسی آیا۔ ممتاز کو دیکھا اور اس کے حسن پر مر مٹا۔ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ممتاز کے والدین کا دل جیت کر ممتاز سے نکاح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ممتاز بیگم جب اپنے مجازی خدا کے ساتھ شہر پہنچی تو اس تلخ حقیقت سے آشکار ہوئی کہ وہ لڑکیوں کے ایک دلال کے شکنجے میں پھنس گئی ہے۔ اُس کے سنہرے سپنے بکھر گئے۔ وہ خود بھی بکھرنے لگی۔ اُسے ناچنے گانے اور جسم فروشی کے لیے مجبور کیا جانے لگا مگر ممتاز انکار کرتی رہی۔ اپنے ارادے پر ڈٹی رہی۔

ممتاز ایک بیٹے کی ماں بنی۔ چند دنوں کے لیے آرام پا گئی مگر وقت بیتنے کے ساتھ اُس کا شوہر مجید پھر اُس پر ظلم کرنے لگا۔ آخری چال اُس نے یہ چلی کہ ممتاز کے بیٹے کو اُس سے چھین لیا۔ اُس کی نظروں سے دُور کر دیا — یہاں ممتاز ہار گئی... ممتاز جھک گئی۔ ٹوٹ گئی۔

اُس نے ایک سمجھوتہ کیا — کہ وہ ناچے گی، گائے گی، مگر جسم فروشی نہیں کرے گی۔

اُس کے گیت مقبول ہوئے۔ ریکارڈ بننے لگے۔ وہ اپنے گیتوں میں اپنے بیٹے کو پکارتی رہی۔

اسی دوران ممتاز نے محسوس کیا کہ وہ پھر ماں بننے والی ہے۔ پہلے بچے کا انجام وہ دیکھ چکی تھی۔ دوسرا بچہ نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی مگر وہ آ گئی۔ پھول سی نازک بیٹی۔ ممتاز کی قسمت کے اندھیروں کو ابھی کچھ اور کھیل دکھانا منظور تھا۔ بازارِ حسن کے رسیا، ایک چھوٹی سی ریاست کے شہزادے نے ممتاز کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ اُس نے ممتاز کو حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

مجید گھر آئی دولت کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنا چاہتا تھا۔ ممتاز کے انکار سے وہ تشدد پر اُتر آیا۔ اُس نے ممتاز کو جبراً کنور کے کمرے میں پہنچا دیا۔

کنور تو ممتاز کے نام ریاست لکھ دینے کو تیار تھا لیکن ممتاز نے مانگا صرف ایک وظیفہ جو اُس کے دونوں بچوں کو اُس وقت تک ملتا رہے جب تک وہ دونوں اپنے پانو پر نہ کھڑے ہو جائیں۔ مجید کی لاعلمی شرط تھی۔ کنور نے منظور کر لیا— اور ایک ماں نے اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے اپنے حال کو قربان کر دیا۔

صبح جب مجید ممتاز کو نئی زندگی کی مبارک باد دینے آیا تو دیکھا، ممتاز اپنی منزل پر پہنچ چکی ہے۔ ہر دکھ اور ظلم سے دُور اَبدی نیند سو چکی ہے۔ مجید غصے سے پاگل ہو گیا۔ اُس نے ممتاز کی لاش شہر کے باہر ندی میں بہادی۔ دنیا کے صفحے سے ایک ماں کو ہٹا کر دو بچوں کو بے سہارا کر دیا۔"

"وہ بچے کہاں ہیں؟ کیا وہ زندہ ہیں؟ کیا کنور نے اپنا وعدہ پورا کیا؟" میں ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ گئی۔

بھائی جان لمحہ بھر خاموش رہ کر بولے "ہاں، کنور نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے اثر ورسوخ سے اُس نے مجید سے دونوں بچے حاصل کر لیے۔ ایک اچھے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رکھا۔ اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اپنی ہستی کو راز میں رکھ کر اُس نے ممتاز کے بچوں کی کفالت کی۔ وہ ایک طرح سے خود کو ممتاز کا قاتل سمجھتا ہے— مگر جب ممتاز کا بیٹا سمجھ دار ہو گیا، تو کنور نے ایک خط لکھ کر اُسے ممتاز کے حالات سے آگہی کرائی اور معافی کا طلب گار رہا۔" بھائی جان اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے تو میں نے بے تابی سے کہا— "رُک کیوں گئے بھائی جان۔ آگے بولیے نا۔"

"جب ممتاز ہی نے کنور کو معاف کر دیا تھا تو ممتاز کے بچوں کا کنور سے خفا رہنا مناسب نہیں۔ بلکہ ممتاز کے بچوں کو کنور کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ کیوں سعدیہ! کنور سے ملنا پسند کرو گی؟"

"بھائی جان!" عالم حیرت میں میرے منہ سے چیخ نکل گئی "کیا ممتاز بیگم ہماری ماں ہیں؟"

ہاں۔ کہہ کر بھائی جان نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ میں سسک کر رو پڑی۔ وہ میرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہے تھے— "ہاں سعدیہ! یہ پکار ہماری ماں کی ہے... یہ پکار ہماری ماں کی ہے۔"

[ماخوذ]

نگار عظیم

فریم

کال بیل پر انگلی رکھنے کے بعد وہ خود ہی دروازہ کھول کر آنگن عبور کرتی ہوئی اندر آچکی تھی۔ بیل کی آواز سن کر سلمان بھی کمرے سے باہر آچکا تھا۔

''ہائے!''

''ہیلو''

''ہاؤ سلمان!''

''فائن!''

ایک دوسرے کی طرف بڑھ کر دونوں نے ہاتھ ملایا اور پھر سلمان کا دایاں رخسار اس لڑکی کے دائیں رخسار سے اور پھر بایاں رخسار اس کے بائیں رخسار سے مس ہوا۔

اتفاق سے میں سامنے ہی بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ یہ منظر میری آنکھوں سے گزرا تو خون میں کچھ ارتعاش سا محسوس ہوا اور ہاتھ پیروں میں ٹھنڈک سی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچتی وہ دونوں اندر آچکے تھے۔

اماں — یہ ٹورا — بیٹے نے اس کا تعارف دیتے ہوئے کہا۔

''اور آپ ''اماں'' وہ جھٹ سے بولی۔

''اوہ — تو یہ ہے وہ'' فون ریسیو کرتے کرتے، میں اس کی آواز سے کافی مانوس ہوچکی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر مجھے کسی حد تک حیرت ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس کی نرم و نازک شیریں اور جذباتی سی آواز اس کے جسم سے میل نہیں کھاتی تھی۔ وہ کافی لمبی چوڑی تھی۔ میرے ذہن میں اس کی شبیہ بالکل مختلف تھی۔

''ہیلو اماں'' — ''کیسے ہو آپ؟'' سلمان آپ کی بہت باتیں کرتا ہے۔ وہ بے تکلفی سے میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''اماں۔ آپ کو پتہ ہے اس نے مجھے بہت دنوں

تک بدھو بنایا۔ یہ آپ کا لڑکا ہے نا— ؟ اس کی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے میں بول پڑی ''گدھا ہے'' ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی تھی وہ— ''سلمان سنا تو نے— اماں نے تجھے گدھا کہا ہے۔''

اماں آپ کو بتاؤں اس نے مجھے کیسے بدھو بنایا۔ مجھے ہی نہیں سارے دوستوں کو اماں— سب کو— سلمان بتادوں اماں کو— ؟ ''اماں کو پتہ ہے'' سلمان نے بے پروائی سے جواب دیا۔

اماں معلوم ہے آپ کو؟— اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''لیکن کیا— ؟''

میں بتاتی ہوں اماں— ایک لڑکی کا فوٹو دکھاتا تھا سب کو اور بتاتا تھا یہ میری گرل فرینڈ ہے۔ پھر جب آپ اسکول اینول فنکشن میں آئیں تب پتہ چلا یہ تو اماں ہیں۔ تب اس کو سب نے مل کر خوب پیٹا اماں۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

وہ جتنی دیر تک بیٹھی رہی بولتی رہی۔ ایسا لگتا تھا چپ رہنا اسے آتا ہی نہیں۔ سلمان اب تک تیار ہو چکا تھا۔ جب میں نے دروازے پر خدا حافظ کہا تو اس نے بھی خدا حافظ کہا اور بے تکلفی سے سلمان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ بائک پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں چلے گئے لیکن میرے ذہن پر ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئے۔ جینس اور ٹاپ پہنے خوب صورتی سے یوشیپ میں تراشے گئے لہراتے بال اور سانولی صورت پر بڑی بڑی شوخ اور چنچل آنکھوں والی یہ لڑکی اپنے چھتنارسے وجود کے ساتھ مجھے اچھی تو بہت لگی لیکن سلمان کی بیوی یا میری بہو کے فریم میں کہیں فٹ نہیں بیٹھتی تھی۔ لہٰذا میں نے اپنے ذہن کو جھٹکا دیا۔ میں بھی پتہ نہیں کیا کیا خرافات سوچنے لگتی ہوں— دونوں اچھے دوست بھی تو ہو سکتے ہیں۔ اب زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے اور پھر آہستہ آہستہ سلمان کی دوستوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایشکا، ریشکا، نیتکا، انجو، موہنی، ڈیبی، میناکشی کے ساتھ روہن اور راج جب گھر آئے تھے تو میں پاگل ہی ہوگئی تھی۔ اُف۔ کیا لباس تھے ان لڑکیوں کے— مختصر سے مختصر ترین۔ بے جھجک انداز۔ ان سب کے چلے جانے کے بہت دیر بعد تک میرے حواس واپس نہیں آئے تھے

اور نہ معلوم کیوں ایک غیر ضروری سا سوال بیٹے سے پوچھ لیا تھا۔ ''تمہاری کلاس میں کوئی مسلم لڑکی نہیں ہے کیا؟''

''یہ کیسا سوال ہے اماں؟'' بیٹے نے ایسے پوچھا جیسے میرا سوال بہت احمقانہ ہو— ''ہیں لیکن نا کے برابر— اور جو ہیں وہ یا تو بد دماغ ہیں یا مغرور— ''

''کمال ہے'' حیران ہوئی تھی میں۔

اسکول کے بعد کالج میں سلمان کا فرسٹ ایئر تھا۔ ایسے ہی اچانک ایک دن نیلو سلمان کے ساتھ آئی تو گھر میں ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی۔ وہ اس کی اب تک کی تمام دوستوں سے قطعی مختلف— شلوار قمیص پر لہراتا آنچل، لمبی چوٹی، چہرے پر معصومیت اور شرم و جھجک سے مخمور آنکھیں۔

''اماں یہ نیلو ہے— نیلم— ''

واقعی وہ نیلم تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے پہلی ہی نظر میں بھا گئی تھی وہ۔

''نمستے اماں— '' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ادب سے جھکی۔

کیسی ہیں آپ؟ سلمان نے بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

''یہ گھر کی باتیں کالج میں بھی کرتا ہے؟''

''جی۔ بہت۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں اس کے لیے ناشتہ اور چائے وغیرہ لینے کے لیے اٹھی تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے کچن میں آ گئی۔

''اماں آپ بہت کام کرتی ہیں۔ جاب بھی کرتی ہیں۔ اپنا خیال بالکل نہیں رکھتیں آپ!''

کیا یہ بھی تمہیں سلمان نے بتایا تھا؟

''جی— '' اور پھر وہ خود ہی شرما کر مسکرا پڑی۔

اس دن کے بعد سے نیلو بارہا گھر آئی۔ وہ جلدی ہی گھر کے تمام افراد میں گھل مل گئی۔ اس کے مزاج کی نرمی اور لچک سے سب متاثر ہوئے۔ وہ گھر کی ایک فرد بن گئی۔ میرا

دماغ پھر چغلی کھانے لگا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں سلمان کو غلط سمجھ رہی تھی۔ کسی لڑکی کا سلمان کا دوست ہونا بھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بچپن سے ہی اس کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع رہا ہے جس میں بلاشبہ لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ شامل تھیں۔ سلمان نے کبھی کوئی شکایت کا موقع بھی فراہم نہیں کیا تھا۔ الٹا میرے لیے تو یہ بات باعث فکر تھی کہ پچھلے چار برسوں میں سلمان کی اور کوئی دوست کیوں نہیں بنی۔ کیا اتنی بات مجھے یہ سمجھنے کے لیے کافی نہیں کہ نیلو کی معصومیت اس کا مشرقی پن میرے بیٹے کے دل میں ایک خاص جگہ بنا چکا ہے۔ کیا نیلم بھی... لیکن وہ پولیس انسپکٹر کی بیٹی ہے۔ اُف... میں نے اپنے دماغ کو پھر جھٹکا دیا۔ پر ماں ہونا بھی... توبہ....

لیکن اس مرتبہ ماہِ رمضان میں جب نیلو گھر آئی اور میں حسب معمول کچن میں اس کے لیے چائے بنانے گئی تو وہ بھی ہمیشہ کی طرح کچن میں چلی آئی۔ چائے بنانے کے لیے میں نے کیتلی میں پانی ڈالا ہی تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ بہت اپنائیت سے میرے ہاتھ پر رکھا اور دھیمے سے بولی۔

''اماں میرا روزہ ہے۔''

میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ چائے کی کیتلی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ آواز حلق میں اندر کہیں گم ہوگئی۔ قیامت، مانو لمحوں میں سمٹ آئی ہو اور وہ لمحہ اور تنگ اور تنگ ہوتا جا رہا ہو۔

[بشکریہ: استعارہ ۱۲-۱۳]

سعادت حسن منٹو

جی آیا صاحب

باورچی خانے کی دھندلی فضا میں بجلی کا ایک اندھا قمقمہ چراغِ گور کی مانند اپنی سُرخ روشنی پھیلا رہا تھا۔ دھوئیں سے اَٹی ہوئی دیواریں ہیبت ناک دیووں کی طرح انگڑائیاں لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ چبوترے پر بنی ہوئی انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں اُبھر اُبھر کر اپنی موت کا ماتم کر رہی تھیں، ایک برقی چولھے پر رکھی ہوئی کیتلی کا پانی نہ معلوم کس چیز پر ہنسی ہنس رہا تھا۔ دور کونے میں پانی کے نل کے پاس ایک چھوٹی عمر کا لڑکا بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا۔ یہ انسپکٹر صاحب کا نوکر تھا۔

برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا۔ یہ الفاظ ایسے تھے جو اس کی زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکل رہے تھے۔

''جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔''

ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انھیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کے بغیر آرام، یہ کیوں کر ممکن تھا؟

برقی چولھا بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنی حلق سے اُگل رہا تھا۔ کیتلی کا پانی اسی انداز میں کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

دفعتاً لڑکے نے نیند نا قابل مغلوب حملے کو محسوس کرتے ہوئے اپنے جسم کو ایک جنبش دی اور ''جی آیا صاحب'' گنگناتا ہوا پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

دیوار گیروں پر چُنے ہوئے برتن اس لڑکے کو غیر مختتم ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ پانی کے نل سے روزانہ ایک ہی واقعہ دیکھ کر قطروں کی صورت میں آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ بجلی کا قمقمہ حیرت سے اُس لڑکے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے کی فضا سسکیاں بھرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

''قاسم۔ قاسم''

''جی آیا صاحب۔'' لکا جو انہیں الفاظ کی گردان کر رہا تھا، بھاگا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا۔

انسپکٹر صاحب نے کمبل سے منہ نکالا اور لڑکے پر خفا ہوتے ہوئے کہا۔

''بے وقوف کے بچے! آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے۔''

''ابھی لایا صاحب! ابھی لایا صاحب۔''

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد ابھی برتن صاف کرنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اُس کمرے سے آواز آئی۔

''قاسم۔ قاسم۔''

''جی آیا صاحب۔'' قاسم بھاگتا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا۔

''بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے۔ جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ۔ بس بھاگے ہوئے جاؤ۔ سخت پیاس لگ رہی ہے۔''

''بہت اچھا صاحب۔''

قاسم بھاگتا ہوا گیا اور پارسی کے ہوٹل سے جو گھر سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا، سوڈے کی بوتل لے آیا اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دے دی۔

''اب تم جاؤ۔ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو۔ برتن صاف نہیں ہوئے کیا؟''

''ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔''

''اور ہاں برتن صاف کرنے کے بعد میرے سیاہ بوٹ کو پالش کر دینا مگر دیکھنا احتیاط رہے۔ چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے ورنہ۔''

قاسم کو ''ورنہ'' کے بعد کا جملہ بخوبی معلوم تھا۔ ''بہت اچھا صاحب''۔ کہتے ہوئے وہ باورچی خانے میں واپس چلا گیا اور برتن صاف کرنے شروع کر دیے۔ اب نیند اُس کی آنکھوں میں سمٹی چلی آ رہی تھی۔ پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں۔ سر میں سیسہ اُتر رہا تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے... کہ صاحب کے بوٹ بھی پالش کرنے

ہیں۔ قاسم نے اپنے سر کو زور سے جنبش دی اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔

''جی آیا صاحب، جی آیا صاحب! بوٹ صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔''

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رُکا۔ اب اُسے محسوس ہونے لگا کہ نیند ضرور غلبہ پا کر رہے گی۔ لیکن ابھی برتنوں کو دھو کر انھیں اپنی اپنی جگہ پر رکھنا تھا۔ اس وقت ایک عجیب خیال اس کے دماغ میں آیا۔ ''بھاڑ میں جائیں برتن اور چولھے میں جائیں بوٹ، کیوں نہ تھوڑی دیر اسی جگہ سو جاؤں اور پھر چند لمحات آرام کرنے کے بعد۔''

اس خیال کو باغیانہ تصور کرتے ہوئے قاسم نے ترک کر دیا اور برتنوں میں جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی تو اس کے جی میں آیا کہ اُبلتا ہوا پانی اپنے سر پر انڈیل لے اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کے کام میں حارج ہو رہی تھی، نجات پا جائے۔ مگر اتنا حوصلہ نہ پڑا۔

بصد مشکل منہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اس نے سب برتنوں کو بالآخر صاف کر ہی لیا۔ یہ کام کرنے کے بعد اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ آرام سے سو سکتا تھا اور نیند وہ نیند، جس کے لیے اس کی آنکھیں اور دماغ اس شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ اب بالکل نزدیک تھی۔

باورچی خانے کی روشنی گل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھایا اور لیٹ گیا۔ اور اس سے پہلے کہ نیند اُسے اپنے آرام دہ بازوؤں میں تھام لے۔ اس کے کان ''بوٹ، بوٹ'' کی آوازوں سے گونج اُٹھے۔

''بہت اچھا صاحب —!

''بہت اچھا صاحب — ابھی پالش کرتا ہوں۔'' بڑبڑاتا ہوا قاسم بستر پر سے اُٹھا۔ جیسے اُس کے آقا نے ابھی بوٹ روغن کرنے کا حکم دیا ہے۔

ابھی قاسم بوٹ کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا کہ نیند کے غلبے نے اُسے وہیں پر سلا دیا۔

سورج کی خونیں کرنیں اس مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں — قاسم کی کتاب حیات میں ایک اور پراز مشقت باب کا اضافہ ہو گیا۔

صبح جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں بوٹوں کے پاس سویا ہوا دیکھا تو اسے ٹھوکر مار کر جگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ سور کی طرح یہاں بے ہوش پڑا ہے۔ اور مجھے خیال تھا کہ اس نے بوٹ صاف کر لیے ہوں گے۔

نمک حرام!۔ بے قاسم!''

''جی آیا صاحب!''

''قاسم کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں بوٹ صاف کرنے کا برش دیکھا۔ فوراً ہی اس معاملے کو سمجھتے ہوئے اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں سو گیا تھا صاحب! مگر بوٹ ابھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب۔''

یہ کہتے ہوئے اُس نے جلدی جلدی بوٹ کو برش سے رگڑنا شروع کر دیا۔ بوٹ پالش کرنے کے بعد اُس نے اپنا بستر تہ کیا اور اُسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا۔

''قاسم!''

''جی آیا صاحب!''

قاسم بھاگا ہوا نیچے آیا۔ اور اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو آج ہمارے یہاں مہمان آئیں گے۔ اس لیے باورچی خانے کے تمام برتن اچھی طرح صاف کر رکھنا۔ فرش بھی دُھلا ہوا ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ تمہیں ملاقاتی کمرے کی تصویروں، میزوں اور کرسیوں کو بھی صاف کرنا ہو گا۔ سمجھے! مگر خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھار چاقو پڑا ہوا ہے، اسے مت چھیڑنا! میں اب دفتر جا رہا ہوں۔ مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے ہو جانا چاہیے۔

انسپکٹر صاحب جب دفتر چلے گئے۔ قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد اُس نے باورچی خانے کے تمام کام کو ختم کر دیا اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ملاقاتی کمرے میں چلا گیا۔

وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا کہ اُس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھنچ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے گرد وپیش برتن ہی برتن پڑے ہیں اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے، ہوا زوروں پر چل رہی ہے جس سے وہ راکھ اُڑ اُڑ کر فضا کو خاکستری بنا رہی ہے۔ یکا یک اس ظلمت میں ایک سرخ آفتاب نمودار ہوا جس کی کرنیں خوش آشام برچھیوں کی طرح برتن کے سینے میں گھس گھس گئیں۔ زمین خون سے شرابور ہوگئی ہے— فضا خوشی کے قہقہوں سے معمور ہوگئی۔

قاسم یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور اس وحشت ناک خواب سے بیدار ہو کر ''جی آیا صاحب، جی آیا صاحب۔'' کہتا ہوا پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک اور منظر رقص کرنے لگا۔ اب اُس کے سامنے چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ دفعتاً آندھی چلنی شروع ہوئی جس کے ساتھ ہی ایک بدنما اور بھیانک دیو نمودار ہوا جو ان سب لڑکوں کو نگل گیا— قاسم نے خیال کیا کہ وہ دیو اس کے آقا کا ہم شکل تھا مگر قد وقامت کے لحاظ سے وہ اس سے کہیں بڑا تھا۔ اب اس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا— قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ چنانچہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد میز صاف کرنے جا رہا تھا کہ اُسے یکا یک خیال آیا۔ ''آج مہمان آ رہے ہیں۔ خدا معلوم کتنے برتنے صاف کرنے پڑیں گے اور یہ نیند کمبخت کتنی ستا رہی ہے— مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔''

یہ سوچتے وقت وہ میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پونچھ رہا تھا کہ اچانک اُسے قلم دان کے پاس ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا۔ وہی چاقو جس کے متعلق اُس کے آقا نے کہا تھا کہ بہت تیز ہے۔

چاقو کا دیکھنا تھا کہ اُس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہوگئے۔ ''چاقو— تیز دھار چاقو!— یہی تمہاری مصیبت کو ختم کر سکتا ہے۔''

کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اُٹھا کر اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ اب وہ شام کے وقت برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا۔ اور نیند— پیاری، پیاری نیند اب

اُسے بہ آسانی نصیب ہو سکتی تھی۔

انگلی سے خون کی سرخ دھار بہہ رہی تھی۔ سامنے ولی دوات کی سرخ روشنائی سے کہیں چمکیلی۔ قاسم اس خون کی دھار کو مسرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور منہ میں یہ گنگنا رہا تھا۔ ''نیند، نیند— پیاری نیند''۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنان خانے میں بیٹھی سلائی کر رہی تھی اور اپنی زخمی انگلی دکھا کر کہنے لگا۔ ''دیکھئے بی بی جی!''

''ارے قاسم یہ تو نے کیا کیا؟ کمبخت صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہوگا تو نے؟''

''بی بی جی، بس میز صاف کر رہا تھا اور اس نے کاٹ کھایا۔'' قاسم ہنس پڑا۔

''ابے سور اب ہنستا ہے۔ ادھر آ، میں اس پر کپڑا باندھ دوں— مگر اب بتا تو سہی، آج یہ برتن تیرا باپ صاف کرے گا؟''

قاسم اپنی فتح پر زیرلب مسکرا رہا تھا۔

انگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں آ گیا۔ اور میز پر پڑے ہوئے خون کے دھبوں کو صاف کرنے کے بعد خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا۔

''اب اس نمک حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہوں گے۔ ضرور صاف کرنے ہوں گے۔ کیوں میاں مٹھو؟'' قاسم نے انتہائی مسرت میں کھڑکی میں لٹکے ہوئے طوطے سے دریافت کیا۔

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے۔ باورچی خانے میں صاف کرنے والے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا— انسپکٹر صاحب قاسم کی زخمی انگلی دیکھ کر بہت برسے اور جی کھول کر گالیاں دیں مگر اسے مجبور نہ کر سکے۔ شاید اس لیے کہ ایک بار اُن کی اپنی انگلی میں قلم تراش کی نوک چبھ جانے سے بہت درد محسوس ہوا تھا۔

آقا کی خفگی آنے والے مسرت نے بھلا دی اور قاسم کودتا پھاندتا ہوا اپنے بستر میں جا لیٹا۔ تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا۔ مگر اُس کے بعد انگلی کا زخم بھر آیا۔ اب پھر وہی مصیبت نمودار ہوگئی۔

''قاسم! صاحب کی جرابیں اور قمیض دھو ڈالو۔''

''بہت اچھا بی بی جی۔''

''قاسم اس کمرے کا فرش کتنا بدنما ہو رہا ہے۔ پانی لا کر ابھی صاف کرو۔ دیکھنا کوئی داغ دھبہ باقی نہ رہے۔''

''بہت اچھا صاحب۔''

''قاسم شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں۔ انھیں نمک سے صاف کرو۔''

''جی اچھا صاحب۔''

''قاسم! طوطے کا پنجرہ کس قدر غلیظ ہو رہا ہے۔ اسے صاف کیوں نہیں کرتے؟''

''ابھی کرتا ہوں بی بی جی۔''

''قاسم! ابھی خاک روب آتا ہے۔ تم پانی ڈالتے جانا سیڑھیوں کو دھو ڈالے گا۔''

''جی اچھا صاحب۔''

''قاسم! ذرا بھاگ کے ایک آنے کا دہی تو لے آنا۔''

''ابھی چلا بی بی جی۔''

پانچ چھ روز اسی قسم کے احکام سننے میں گزر گئے۔ قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آ گیا۔ ہر روز اسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا اور پھر علی الصباح چار بجے کے قریب بیدا ہو کر ناشتے کے لیے چائے تیار کرنی پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر لڑکے کے لیے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اُس کے ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف بڑھے۔ اور ایک لمحے کے بعد اس کی اُنگلی سے خون بہہ رہا تھا۔ انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی قاسم کی یہ حرکت دیکھ کر بہت خفا ہوئے۔ چنانچہ سزا کی صورت میں اسے شام کا کھانا نہ دیا گیا۔ مگر وہ اپنی ایجاد ترکیب کی خوشی میں مگن تھا۔ ایک وقت روٹی نہ ملی۔ انگلی پر معمولی سا زخم آ گیا۔ مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے نجات مل گئی۔ یہ سودا کچھ برا نہ تھا۔

چند دنوں کے بعد اُس کی انگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا۔ اب پھر کام کی وہ بھرمار شروع تھی۔ پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گزر گئے۔ اس عرصے میں قاسم نے بارہا

ارادہ کیا کہ چاقو سے پھر اپنی انگلی زخمی کر لے۔ مگر اب میز پر سے وہ چاقو اُٹھالیا گیا تھا اور باورچی خانے والی چھری کند تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا۔ اب اُسے ہر وقت باورچی خانے میں موجود رہنا پڑتا۔ کبھی مرچیں پیستا، کبھی آٹا گوندھتا، کبھی کوئلوں کو جلا دیتا، غرض صبح سے لے کر آدھی رات تک اُس کے کانوں میں ''ابے قاسم یہ کر، اے قاسم وہ کر'' کی صدا گونجتی رہتی۔

باورچی دو روز تک نہ آیا۔ قاسم کی ننھی جان اور ہمت جواب دے گئی۔ مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا۔''

ایک بار اس کے آقا نے اُسے الماری صاف کرنے کو کہا جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ الماری صاف کرتے وقت اُسے ڈاڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا۔ بلیڈ کو پکڑتے ہی اس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ دھار تھی بہت تیز اور باریک، اُنگلی میں دور تک چلی گئی، جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔ قاسم نے بہت کوشش کی کہ خون نکلنا بند ہو جائے۔ مگر زخم کا منھ بڑا تھا۔ وہ نہ تھما — سیروں خون پانی کی طرح بہہ گیا۔ یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سپید ہو گیا۔ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گی۔

''بی بی جی، میری انگلی میں صاحب کا اُسترا الگ گیا ہے۔''

جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا۔ فوراً معاملے کو سمجھ گئی۔ چپ چاپ اُٹھی اور کپڑا نکال کر اُس کی انگلی پر باندھ دیا اور کہا ''قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے۔''

''وہ کیوں بی بی جی؟''

''یہ صاحب سے دریافت کرنا۔''

صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور بھی سپید ہو گیا۔

چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے آئے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سن کر اسے فوراً اپنے پاس بلایا۔

''کیوں میاں! یہ انگلی کو ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی ہیں؟'' قاسم خاموش کھڑا رہا۔

''تم نوکر لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ اندھے ہیں اور ہمیں باربار دھوکہ دیا جاسکتا ہے۔ اپنا بستر بوریہ دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہمیں تو تم جیسے نوکروں کی کوئی ضرورت نہیں— سمجھے۔''

''مگر— مگر صاحب۔''

''صاحب کا بچہ— بھاگ جا یہاں سے، تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا— اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔''

قاسم روتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ طوطے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ طوطے نے بھی خاموش میں اس سے کچھ کہا اور اپنا بستر لے کر وہ سیڑھیوں سے نیچے اترتا گیا۔ مگر دفعتاً کچھ خیال آیا اور بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا اور دردانگیز آواز میں اتنا کہہ کر ''سلام بی بی جی— میں ہمیشہ کے لیے آپ سے رخصت ہو رہا ہوں۔'' وہاں سے رخصت ہو گیا۔

خیراتی ہسپتال میں ایک نوخیز لڑکا درد کی شدت سے لوہے کے پلنگ پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ پاس ہی دو ڈاکٹر بیٹھے ہیں۔

اُن میں سے ایک ڈاکٹر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا— ''زخم خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ ہاتھ کاٹنا پڑے گا۔''

''بہت بہتر۔''

یہ کہتے ہوئے دوسرے ڈاکٹر نے اپنی نوٹ بک میں اُس مریض کا نام درج کر لیا۔ ایک چوبی تختے پر جو چارپائی کے سرہانے لٹکا ہوا تھا۔ مندرجۂ ذیل الفاظ لکھے تھے۔

نام: محمد قاسم والد عبدالرحمٰن (مرحوم) عمر: دس سال

(افسانوی مجموعہ ''آتش پارے'' سے ماخوذ)

انتظار حسین

شہرزاد کی موت

شہرزاد نے ایک ہزار ایک راتوں میں خیر سے ہزار سے اوپر کہانیاں سنائیں اور تین بیٹے جنے۔ کہنے والے کا بھلا، سننے والے کا بھلا، کہنے والی شہرزاد جس کی ان کہانیوں کے صدقے میں جان بخشی ہوئی اور اس کے صدقے میں سلطنت کی ان اَن گنت کنواریوں کی جانیں بچ گئیں جنھیں باری باری ایک رات کی ملکہ بننا تھا اور صبح ہونے پر ان کا سر قلم ہونا تھا۔ سننے والوں میں دنیا زاد اور بادشاہ شہریار جس کی ان کہانیوں نے کایا کلپ کر دی۔ عورت ذات کی طرف سے دل پر جو میل آ گیا تھا ہو ڈھل گیا۔ سو وہ جو اس نے وطیرہ پکڑا تھا کہ روز رات کو ایک دوشیزہ سے بیاہ رچایا اور صبح کو اس کا سر اڑا دیا، اس سے اس نے توبہ کی۔

اس خوشی میں سلطنت میں جشن منایا گیا۔ شہر کی آرائش ہوئی۔ سدا برگ لگ گئی۔ رعیت نہال ہوگئی۔ مگر شہرزاد کا یہ حال تھا کہ بھوچکی ہو کر ارد گرد دیکھتی تھی کہ شب و روز اچانک کیسے بدل گئے۔ ایک ہزار ایک راتوں والی خوب بھری فضا، جب وہ موت کے سائے میں کہانی سنایا کرتی تھی اس پر ایسی چھا گئی تھی کہ اس سے نکل ہی نہیں پا رہی تھی اور جب اسے تھوڑا اعتبار آیا کہ وہ راتیں واقعی گزر گئی ہیں تو اسے ایک حیرت نے آلیا۔ سوچتی تھی اور حیرت کرتی تھی کہ اچھا میں نے اتنا لمبا رت جگا کیا تھا اور اتنی کہانیاں سنائی تھیں۔ اتنی کہانیاں مجھے سوجھیں کہاں سے۔ غیب ہی سے آئی ہوں تو آئی ہوں۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ ایک رات دنیا زاد کو اپنے پاس بٹھایا اور بولی: ''اے میری بہن دنیا زاد، اب میں سوچتی ہوں تو میری عقل چکرا جاتی ہے۔ ایک ہزار ایک راتیں میں نے کہانیاں کہہ کہہ کر کاٹ دیں۔ کچھ تو ہی مجھے سمجھا کہ یہ سب ہوا کیسے؟''

دنیا زاد بولی: ''اے میری ہمشیرۂ ہزار داستان! میں تو خود دریائے حیرت میں غرق ہوں کہ میری بہن کے حافظہ میں کہانیوں کا اتنا بڑا خزانہ دبا ہوا تھا۔ عزیز بہن، ویسے تو وہ

راتیں خوف کی راتیں تھیں، دل کو دھڑ کا لگا رہتا تھا کہ صبح چڑھے گی تو کیا گل کھلائے گی۔ موت مستقبل آس پاس منڈلاتی نظر آتی تھی مگر یہ کالی ڈراؤنی راتیں، اے مری عزیز بہن، تیری کہی ہوئی کہانیوں سے جگ مگ جگ مگ کر رہی ہیں۔ جب کہانی شروع ہو جاتی تھی تو پھر پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کتنی رات گئی اور کب ختم ہوئی اور بادشاہ کا یہ حال کہ مبہوت بیٹھا سنتا رہتا تھا۔"

شہرزاد بولی: "بہن! مجھے تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا، بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کہانی کہنی ہے اور زندہ رہنا ہے۔ پھر کہانیوں میں ایسی کھوگئی کہ زندہ رہنے کا خیال بھی پیچھے چلا گیا۔ لے دے کے ایک ہی لگن لگی رہتی تھی کہ جو کہانی شروع کی ہے اسے انجام تک پہنچانا ہے۔"

"سو بی بی وہ انجام کو پہنچ گئی اور کیا خوف انجام کو پہنچی کہ بادشاہ کی کایا ہی بدل گئی۔ کہاں عورت ذات سے اتنی نفرت کہ روز ایک نسوانی سر قلم ہوتا تھا۔ کہاں اب وہ تمہارے پیر دھو دھو کے پیتا ہے۔"

پھر دونوں نے مل کے ان راتوں کے خوف واندیشہ کو اور دکھ درد کو یاد کیا اور خوب روئیں۔ پھر آنسو پونچھے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ مصیبت کی گھڑیاں کٹ گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہانیاں کہنے کی توفیق عطا کی اور ان کہانیوں کے طفیل جان بچی۔

دنیازاد کی باتیں سن کر کچھ رو دھو کر شہرزاد کا جی ہلکا ہو گیا۔ اب جشن بھی تمام ہو چکا تھا۔ سلطنت کا کاروبار معمول کے مطابق چلنے لگا۔ ایک ہزار ایک راتیں بھی قصہ ماضی بن چکی تھیں۔ شہرزاد شہریار کی چہیتی ملکہ اور تین ہونہار شہزادوں کی ماں بن کر محل میں راج کرنے لگے۔ دنیازار نے بہن کی چاہت میں شادی بیاہ کا خیال دل سے نکالا۔ بس بہن کا سایہ بن کر محل میں رہنے لگی۔

بیٹے بڑے ہوئے۔ دھوم سے ان کی شادیاں ہوئیں۔ چاند سی بہوئیں گھر میں آئیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں باری باری ان کی کوکھ ہری ہوئی۔ پھول سی بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ یہ بچیاں جب ذرا بڑی ہوئیں تو دنیازاد نے دیکھا کہ ان کا جی کھیل کود میں کم اور کہانیاں سننے میں زیادہ لگتا ہے۔ ان کا یہ شوق دیکھ کر ان سے کہا کہ بچیو، کہانیاں سننے کا تمہیں ایسا ہی شوق ہے تو اپنی

دادی سے سنو۔ کہانی سنانے میں ان کا دنیا کے پردے پر کوئی ثانی نہیں۔

یہ سن کر تینوں بچیاں شہرزاد کے گرد اکٹھی ہوگئیں اور لگیں ضد کرنے کہ ہم تو آپ سے کہانی سنیں گے۔ بچیوں کی ضد دیکھ کر شہرزاد بہت سٹپٹائی۔ وہ ملکہ بن کر بھول ہی گئی تھی کہ کبھی وہ کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ بچیوں کو ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کہاں ٹلنے والی تھیں۔

ادھر دنیازاد نے بہن کو ٹوکا ''اے بہن! مجھے بولنے کا حق تو نہیں، دادی پوتیوں کا بیچ میں میں بولنے والی کون، مگر انصاف کی بات تو کہنی ہی پڑتی ہے۔ آخر یہ تمہاری پوتیاں ہیں، گھر میں دادی بیٹھی ہے جو کہانیاں سنانے میں طاق ہے۔ پوتیاں آخر دادی کے فیض سے کیوں محروم رہیں اور گھر چھوڑ کر کس دروازے کو کہانیوں کے لیے کھٹکھٹائیں۔''

شہرزاد بہن کی بات سن کر پسیجی۔ پوتیوں سے بولی: ''اے چندا! میں تمہارے قربان جاؤں، تمہیں کہانی نہیں سناؤں گی تو کسے سناؤں گی مگر ابھی تو دن ہے۔ کہانی دن میں سنائی جائے تو مسافر رستہ بھول جاتا ہے۔ رات ہو جانے دو۔ پھر میں تمہیں کہانی سناؤں گی۔''

کہانی سننے کی آس میں رات کا کس شدت سے انتظار کیا گیا۔ رات آئی اور تینوں پوتیاں شہرزاد کے گرد اکٹھی ہوگئیں۔ دنیازاد بھی قریب آن بیٹھی۔ کتنے زمانے بعد اسے ایک مرتبہ پھر شہرزاد سے کہانی سننے کا موقع مل رہا تھا۔

مگر عجب ہوا۔ شہرزاد نے بہت سوچا، بہت یاد کیا، اسے کوئی کہانی یاد ہی نہیں آئی۔ پریشان ہوکر دنیازاد سے بولی: ''اے دنیازاد! میرے تو حافظہ پہ پتھر پڑ گئے ہیں، کیا سناؤں مجھے تو کوئی کہانی یاد ہی نہیں آرہی۔''

''لو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔'' دنیازاد بولی ''تم نے اپنے سرتاج کو اتنی کہانیاں سنائی تھیں انھیں میں سے کوئی کہانی ان بچیوں کو سنا دو۔''

''مگر کون سی سناؤں، مجھے تو کوئی کہانی یاد نہیں آرہی۔''

''اے بہن، وہ جو تم نے پہلی رات کو سنائی تھی سوداگر اور دیو کی کہانی وہی سنا دو۔''

''سوداگر اور دیو کی کہانی...'' شہرزاد بڑبڑائی۔

یاد کرنے لگی کہ وہ کیا کہانی تھی۔ کچھ یاد نہ آیا تو پریشان ہوکر کہا ''اے دنیازاد،

سوداگر اور دیو کی کہانی میں کیا ہوا تھا مجھے تو کچھ یاد نہیں آ رہا۔"

"اے لو اپنی کہی ہوئی کہانی بھول گئیں۔ اس میں یہی تو ہے کہ سوداگر نے چھوارا کھا کر گٹھلی پھینکی۔ گٹھلی کا پھینکنا تھا کہ دھواں اٹھا۔ دھوئیں میں سے ایک دیو برآمد ہوا۔ گرجنے لگا کہ تیرے چھوارے کی گٹھلی میرے بیٹے کے سینے میں جا کر لگی۔ وہ مر گیا۔ اب میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ مرنے کے لیے تیار ہو جا۔"

شہرزاد نے غور سے سنا۔ پھر یاد کرنے کی کوشش کی کہ آگے کیا ہوا تھا۔ جب کچھ یاد نہ آیا تو دنیازاد سے بولی کہ "میری بہن دنیازاد، مجھے تو اب کچھ بھی یاد نہیں ہے لگتا ہے کہ تجھے یہ کہانی پوری یاد ہے۔ پھر تو ہی کیوں نہیں سنا دیتی۔"

دنیازاد نے سوچا اور بولی کہ "بلبل ہزار داستان تو تم ہو۔ بیان میں تم جو جادو جگاتی تھیں وہ تو میں نہیں جگا سکتی۔ جیسی تم سے سنی اسے اپنے ٹوٹے پھوٹے انداز میں سنائے دیتی ہوں مگر اس شرط پر کہ کل اس سے آگے کی کہانی تم سناؤ گی۔"

شہرزاد نے یہ شرط مان لی اور دنیازاد نے بچیوں کو خوب مزے لے لے کر سوداگر اور دیو کی کہانی سنائی۔ کہانی سن کر تینوں کھل اٹھیں۔ دنیازاد نے کہا کہ "بچیو، میری زبان میں شہرزاد والا جادو کہاں۔ جب تم کل رات اپنی دادی سے کہانی سنو گی تب دیکھنا تمہیں کتنا لطف آئے گا۔"

دنیازاد سے کہانی سن کر شہرزاد کے حافظہ میں ہلچل مچ گئی۔ ساری کہی ہوئی کہانیاں اس دل و دماغ میں منڈلانے لگیں لیکن ٹکڑوں، نوالوں کی صورت میں۔ خیر کوئی بات نہیں، شہرزاد نے اطمینان کی ایک کیفیت کے ساتھ سوچا، میرا حافظہ جاگ اٹھا ہے۔ کل جب کہانی کہنے بیٹھوں گی تو انشاءاللہ سب کچھ یاد آ جائے گا۔ سو دوسری رات وہ بہت اعتماد کے ساتھ اپنی پوتیوں کو لے کر بیٹھی۔ دنیازاد بھی اس کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی مگر شہرزاد کو بس اتنا یاد آیا کہ اگلی کہانی جو اس نے سنائی تھی وہ ماہی گیر اور دیو کی کہانی تھی۔ اس سے آگے اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ دنیازاد نے لقمہ دیا کہ "اے بہن ہوا یوں تھا کہ ماہی گیر نے دریا میں جال ڈالا۔ جال بھاری ہوا تو اس نے سمجھا کہ کوئی موٹی مچھلی پکڑی گئی، مگر جب جال کھینچا تو اس

میں تو ایک پیتل کی سر بہ مہر لٹیا پھنسی ہوئی تھی۔ مہر حضرت سلیمان کی تھی۔ مہر کو توڑ کر لٹیا کا منھ کھولا تو اس میں سے ایسا کالا دھواں نکلا کہ اندھیرا چھا گیا اور اس دھوئیں کے بیچ سے ایک لحیم شحیم دیو دڑ ونکتا ہوا نکلا۔''

شہرزاد حیرت سے بولی: ''دنیازاد لگتا ہے کہ یہ کہانی بھی تجھے ہی پوری یاد ہے۔ پھر تو ہی سنا دے۔ مجھے تو کہانی کی کوئی بات یاد نہیں آ رہی۔''

دنیازاد تو اب ماشاء اللہ چل نکلی تھی۔ اس نے ماہی گیر اور دیو کی کہانی شہرزاد والی شان سے شروع کی اور صبح ہوتے ہوتے پوری کہانی سنا دی اور شہرزاد نے کہانی ایسے سنی جیسے وہ ہے ہی دنیازاد کی کہی کہانی۔ وہ تو بس سننے والیوں میں ہے۔ تینوں نواسیوں کا جی بھی کہانی سن کر باغ باغ ہو گیا۔

اگلی رات شہرزاد کو یقین تھا کہ اسے اگلی کہانی یاد آ جائے گی۔ جب وہ کہانی یاد نہ آئی اس نے دوسری کہانیوں کی طرف ذہن دوڑایا۔ الہ دین کے چراغ والی کہانی اسے جہاں تہاں سے یاد آتی مگر کڑی سے کڑی نہیں مل رہی تھی۔ پھر دنیازاد ہی کو وہ سنانی پڑی۔

بس پھر تو شہرزاد کو مساوات پڑ گئی۔ وہ کہانی یاد کرنے کی کوشش کرتی۔ اسے تو کہانی یاد نہ آتی۔ اس کی فرمائش پر دنیازاد کہانی سنانی شروع کر دیتی۔ بس اسی طرح دنیازاد نے ساری الف لیلہ سنا ڈالی۔

شہرزاد نے ڈوب کر یہ کہانیاں سنیں۔ یہ سب کہانیاں میں نے سنائی تھیں، اسے کتنی حیرت ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ حیرت کی جگہ اداسی نے لے لی۔ اسے ایک ایک کر کے وہ ساری راتیں یاد آئیں۔ ایک ہزار راتیں جب اس نے یہ کہانیاں سنائی تھیں۔ ہر رات کو یوں لگتا تھا کہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے مگر اب ان میں سے ایک رات یوں دکھائی دے رہی تھی کہ وہی اس کی زندگانی کا حاصل تھی۔ وہ راتیں ایک سحر بن کر اس پر چھاتی چلی گئیں۔ اصل میں تو میں نے انھیں راتوں میں زندگی کو پایا تھا، اس نے اداس ہو کر سوچا اور ایک دفعہ پھر وہ سوئی ہوئی راتیں جاگ اٹھیں اور اس کے ارد گرد منڈلانے لگیں۔ رات بھگتی جاتی اور ہوا اپنے کرداروں کے ساتھ اجنبی جزیروں، سمندروں، صحراؤں میں بھٹکتی پھرتی۔ اتنی دور نکل

جاتی کہ موت اور زندگی کے سارے اندیشے اور وسوسے کہیں بہت پیچھے رہ جاتے۔ پھر جب پو پھٹتی اور مرغ سحر کی بانگ سنائی دیتی تو وہ کس اعتماد سے کہانی کو اگلی رات پر موقوف کرتی کہ موت سہم کر پیچھے ہٹ جاتی۔

شہرزاد کتنی دیر تک ان کہانیوں سے لبریز راتوں کے سحر میں کھوئی رہی۔ اس سحر سے نکلی تو اب کی راتوں کا خیال آیا اور اب، اس نے سوچا۔ اب میری راتیں ویران ہیں۔ صرف کالی اور لمبی ہیں۔ ان کا جادو رخصت ہو چکا ہے۔ میری راتیں جو بانجھ ہو چکی ہیں، ا اس نے لمبا ٹھنڈا سانس بھرا اور گہری اداسی میں ڈوب گئی۔

جب بادشاہ محل میں آیا تو دیکھا کہ شہرزاد خلاف معمول چپ چاپ ہے۔ صورت سے اداسی ٹپکتی ہے۔ خیر اس دن تو وہ چپ رہا مگر جب دیکھا کہ شہرزاد کی طبیعت بحال ہونے ہی میں نہیں آ رہی اور اداسی گہری ہوتی چلی جا رہی ہے تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ آخر رہا نہ گیا اور ایک روز پوچھ لیا کہ ''ارے شہرزاد میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ نہ وہ پہلی سی شوخی نہ طراری۔ نہ ہنسنا نہ بولنا، طبیعت افسردہ۔ چہرے کی رنگت پھیکی پھیکی۔ یہ کیا حال ہے۔ کون سا غم ہے کہ تجھے گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔''

اس پر شہرزاد نے ضبط کا دامن چھوڑا۔ روئی اور بولی: ''اے مرے سرتاج! تو کس شہرزاد کا حال پوچھتا ہے جو شہرزاد چہکتی بولتی کہانیاں سناتی تیرے محل میں آئی تھی وہ تو کب کی مر چکی۔''

بادشاہ یہ سن کر ٹپٹایا۔ پریشان ہو کر بولا: ''یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ اگر طبیعت پہ کوئی ملال ہے تو اس کی وجہ تو معلوم ہونی چاہیے۔''

''اے بادشاہ، اے مرے سرتاج'' شہرزاد غم زدہ آواز میں بولی: ''تو نے میری جان تو بخش دی مگر مجھ سے میری کہانیاں چھین لیں۔ مگر میں تو انھیں کہانیوں میں زندہ تھی۔ وہ کہانیاں ختم ہوئیں تو سمجھو کہ میری کہانی بھی ختم ہو گئی۔''

(ماخوذ)

جابر حسین

ڈولابی بی کا مزار

ماموں جان نے اچانک رحیم میاں کو تانگا روکنے کے لیے کہا۔

تانگا ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گیا۔ میں نے کچھ حیرت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں چھپا سوال پڑھ کر ماموں جان بولے—

''حسین آباد ابھی نہیں آیا'' دور ہے۔ لیکن بیٹا یہ درگاہ اس سے زیادہ اہم ہے۔ حضرت کی درگاہ ہے، ہمارے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ انھیں کا مزار ہے، انھیں کی درگاہ ہے۔ زیارت کرتے چلیں۔''

ہم تانگے سے اتر کر درگاہ کے بڑے پھاٹک کی طرف بڑھے ہی ہیں کہ ماموں جان نے یک بارگی رُک کر کہا—

''اور یہ سامنے حضرت کی بیٹی'' نانہو بی بی کا مزار ہے۔ لوگ باگ اسے ادب سے ڈولابی بی کا مزار کہتے ہیں۔''

''ڈولابی بی؟''

''ہاں'' ڈولابی بی۔ تفصیل راستے میں بتاؤں گا۔ ابھی صرف فاتحہ پڑھ کر چلے چلنا ہے۔''

میرے چھوٹے سر پر سیاہ مخمل کی نازک سی ٹوپی چڑھی ہے۔

عرب والی نانا کی حویلی سے نکلتے وقت پتہ نہیں کس نے میرے سر پر یہ ٹوپی رکھ دی ہے۔

''بزرگوں کی بستی ہے'' ادب سے پیش آنا۔ خالی سر جاؤ گے تو لوگ ہنسیں گے۔'' کسی نے آنگن کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے کہہ دیا ہے۔

ظاہر ہے، ٹوپی میرے سر کے ناپ سے نہیں بنی ہے۔ ادھر ادھر، کان کے تھوڑا اوپر، ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ ماموں جان ٹوپی کو لے کر میری بے چینی دیکھ دیکھ، اندر اندر، مسکرا رہے ہیں۔

بار بار ٹوپی کا سرا بدل کر اسے اپنے سر پر فٹ بیٹھانے کی میری کوشش کام نہیں آ رہی ہے۔

بزرگوں کی بستی کا سفر ہے اور سب کا ادب واحترام کرنا ہے، اس لیے سر پر ٹوپی کا ہونا لازمی ہے۔ ٹوپی اپنی ہو، یا کسی اور کی، پر ہو ضرور!

ماموں جان نے ڈولابی بی کے مزار پر اپنا ہاتھ رکھا، نہایت ادب سے آنکھیں بند کیں، اور اللہ سے نہ جانے کیا کیا مکالمہ کیا۔ میں ان کے بازو میں کھڑا ان کی نقل بھر کرتا رہا۔ آنکھیں میں نے ضرور بند نہیں کیں، کھلی رکھیں۔

آگے، کھلے میدان کے اس طرف، حضرت کا مزار ہے۔

خوب صورت محرابوں سے گھری عمارت، دالان اور چھوٹی چھوٹی راہ داریاں۔

صبح بس تھوڑی دیر قبل ہوئی ہے، اس لیے زیادہ تر لوگ مسجد سے نماز پڑھ کر نہیں لوٹے ہیں اور درگاہ میں کسی قدر سناٹا چھایا ہے۔ صرف مجاور صاحب مزار کی سیڑھیوں کے پاس نظر آرہے ہیں۔

ماموں جان کو دیکھتے ہوئے مجاور صاحب بولے:

"آپ کب آئے، اور یہ بچہ؟

"بھانجہ ہے، ناجو بوبو کا چھوٹا بیٹا، سرور۔"

سرور! میں نے چونک کر ماموں جان کو دیکھا۔

میرا یہ نام تو کب کا بدل گیا۔ ماموں جان کو اتنا تک بھی معلوم نہیں!

ماموں جان کی غلطی سدھارنے کی خواہش نے سر اٹھایا، لیکن عرب والی ننا کی حویلی میں بزرگوں کی کہی بات یاد ہو آئی۔

"بزرگوں کی بستی میں جارہے ہو، ادب سے پیش آنا، ورنہ لوگ باگ ہنسی اڑائیں گے۔"

میں نے ادب سے مجاور صاحب کو سلام کیا۔ حضرت کے مزار کا طواف کیا، ماموں جان کی نقل کرتے ہوئے دونوں ہاتھ مزار کی مخملی چادر پر رکھے، اور اللہ سے اپنے بزرگوں کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں۔

مجاور صاحب نے چائے کے لیے ماموں جان کو روکنا چاہا، مگر وہ حسین آباد جلدی پہنچنے کے نام پر فرصت پا گئے۔

تانگے تک آتے آتے میں نے ماموں جان سے کہا—

''آپ کو معلوم نہیں، میرا نام بدل گیا ہے، اب میں سرور نہیں ہوں...''

''کس نے بدلا یہ نام تمہارے ابو نے؟''

مجھے خود نہیں معلوم، میرا نام کس نے بدلا۔ لوگوں کی زبانی سنتا ضرور ہوں، لیکن سمجھ میں نہیں آتی ہے کوئی بات۔ بہت دنوں بعد، معلوم چلا کہ کرائے کے ایک بڑے وسیع مکان کے آنگن میں، ایک کنارے، کسی پھل دار سائے میں کھیلتے کھیلتے ہمارے چھوٹے بھائی اکبر کے اچانک بیمار پڑنے اور گھنٹے دو گھنٹے میں ہی چل بسنے کے فوراً بعد دادی نے، آناً فاناً ہمارے نام بدل دیے اور ہم لمحہ بھر میں سرور حسین جابر حسین ہو گئے۔

ماموں جان کو میرا یہ نیا نام بے حد ناپسند ہوا۔ لیکن وہ بھی بزرگوں کا ادب کرنے والی روایت کا حصہ ہیں، اس لیے دادی جان کی شان میں کچھ بھی کہنا انھوں نے مناسب نہیں سمجھا۔

اس بیچ رحیم میاں کا تانگا درگاہ سے آگے نکل کر بستی کی پتھریلی سڑک پر آ گیا ہے۔

''ڈولا بی بی کا قصہ؟''

میں نے ماموں جان سے سوال کیا۔

''ہمارے تمہارے، سب کے مورث ہیں، حضرت مخدوم شاہ شعیب۔ انھیں کی اکلوتی بیٹی تھیں، نانہو بی بی، جن کا یہ مزار ہے۔ حضرات انھیں بے حد مانتے تھے۔ ان کی مرضی کے خلاف خاندان والوں نے بیٹی کی شادی ایسے گھرانے میں کرا دی، جہاں سود کا کاروبار چلتا تھا۔ سود سمجھتے ہو نا؟''

''جی، دادی جان کہتی ہیں، سود کا پیسہ حرام ہوتا ہے۔''

''ہاں'' وہی۔ بیٹی ابھی رخصت ہو کر، ڈولے پر سوار ہو کر، بستی کے باہر بھی نہیں گئی ہو گی کہ شاہ صاحب نے اپنے مریدوں کو ہدایت دی—

''سامنے، گلی کے بالکل پاس والی جگہ پر، ایک قبر تیار کراؤ۔''

قبر؟ سب نے حیرت سے شاہ صاحب کو دیکھا۔

''بیٹی ابھی ابھی رخصت ہوگئی ہے۔'' شاہ صاحب نے کچھ جلال بھرے لہجے میں کہا۔
شاہ صاحب کے حکم کی تعمیل شروع ہوگئی۔ گھنٹے بھر میں قبر تیار ہوگئی تو شاہ صاحب معائنہ کرنے کو آئے۔ قبر دیکھتے ہی بولے:

''چھوٹی ہے، اسے کشادہ بناؤ، چاروں طرف سے، اتنی ہی اور گہری کردو۔''

قبر کے آس پاس، آنکھیں پھاڑے، بھیڑ کی شکل میں لوگ پتھر بنے شاہ صاحب اپنے حجرے میں چلے گئے۔ کافی دیر تک وہ اپنے حجرے میں ہی رہے۔ کیا کرتے رہے، کسی کو نہیں معلوم ہو پایا۔

اچانک باہر شور ہوا۔ کسی نے بستی کی باہری سرحد سے بھاگتے بھاگتے آکر خبر دی—

''نانھو بی بی کی لاش آرہی ہے۔ اسی ڈولے سے، جس پر کچھ گھنٹہ پہلے انھیں رخصت کیا گیا تھا۔ سسرال پہنچتے پہنچتے اللہ نے انھیں اپنے پاس بلالیا۔''

تھوڑی دیر بعد، کچھ اور ہرکارے آئے، نانھو بی بی کا ڈولا آیا، اور اس ڈولے پر، دلہن کے لباس میں، نانھو بی بی کی لاش بھی آئی۔

بستی میں ماتم چھا گیا۔ کون آنکھ تھی، جو آنسوؤں کی جھیل نہیں بن گئی۔ کون سینہ تھا، جو غم سے چھلنی نہیں ہوگیا۔

شاہ صاحب اپنے حجرے سے باہر آئے۔ بیٹوں کو، رشتہ داروں کو، بستی والوں کو دلاسہ دیا—

''اللہ کی مرضی یہی ہے، اس میں کس کو دخل!''

شاہ صاحب نے آنسو روک کر اپنے آدمیوں سے کہا—

''ڈولا اسی طرح قبر میں ڈال دو۔''

بستی والوں نے نماز پڑھی اور شادی کے ڈولے میں سوار معصوم نانھو بی بی کو اسی طرح قبر کی گود میں ڈال دیا۔

گھنٹوں بعد، جب نانھو بی بی کے ساتھ ڈولے میں گئی 'بوا' کی بے ہوشی اور آنسو تھمے، تو بستی والوں کو ان کی موت کا قصہ معلوم ہوا۔

بوا نے بتایا، سسرال کی سرحد کے آس پاس، کہاروں نے ذرا ستانے کو ڈولا روکا، تو وہ بھی اپنے پیر پھیلانے کے ارادے سے ڈولے کے باہر نکل آئی۔ آس پاس کھیتوں میں کام کر رہی عورتوں سے بوا کو سسرال والوں کے بارے میں تفصیل معلوم ہوئی۔ سود کے کاروبار کی بابت بھی انھیں پتا چلا۔

ڈولے میں بیٹھی نانہو بی بی نے بوا کی بات سن کر ان سے پانی مانگا، وضو کیا، نماز پڑھی اور زار و قطار آنسوؤں کے بیچ درگاہِ الٰہی میں دعا کے لیے اپنے ہاتھ پھیلائے ——

''پالنے والے'' میری محافظت فرما۔ میرے حلق میں حرام کا دانا پانی جائے، اس سے پہلے مجھے اس دنیا سے اٹھا لے۔ پروردگار! مجھے اپنے پاس بلا لے۔ تجھ کو تیری عظمتوں کا واسطہ، میرے رب!''

کہتے ہیں، نانہو بی بی کا سر سجدے سے اوپر نہیں اٹھا۔ اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی...

ماموں جان اتنا بولتے بولتے رک گئے۔ میں نے اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ رومال سے انھوں نے اپنا چہرہ ڈھک لیا ہے۔ میں ان کی دبی دبی سسکیاں صاف سن رہا ہوں۔

رحیم میاں کا تانگا ایک جھٹکے کے ساتھ رک گیا ہے۔

ہم حسین آباد کی سرحد میں داخل ہو گئے ہیں۔ نواب صاحب کی حویلی سامنے نظر آ رہی ہے۔

حویلی کے صحن میں بیٹھے کچھ بزرگ ماموں جان کا انتظار کر رہے ہیں۔

(ماخوذ)

(جابر حسین صاحب کے بچپن کا یہ بظاہر ایک معمولی اور چھوٹا سا ورق ہے مگر اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کی فطرت میں حساسیت کی رنگت شروع ہی سے کتنی گہری رہی ہوگی؟ ''بلراج ورما'')

آخری دعا

قبر کے دہانے تک زندگی کا سفر طے کر چکے نور صاحب فجر کی نماز پڑھ کر ایک دن اور جینے کا موقع عطا فرمانے اور بعد عشاء کے پورا دن بخیر وعافیت گزر جانے پر خدا کا شکر ادا کرنا نہ بھولتے۔

اس طرح شکرانے کی زندگی جی رہے نور صاحب اس وقت چونک پڑے جب ان کے دونوں بیٹوں نے انھیں ایک کاغذ پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کرنا چاہا۔

نہیں میں دستخط نہیں کروں گا۔

ابو دستخط تو آپ کو کرنے ہی ہوں گے۔ بڑے بیٹے نے کہا۔

آپ جلدی سے دستخط کر دیجیے۔ ہمیں ابھی امی کے بھی دستخط لینے ہیں۔ چھوٹے بیٹے نے سُر میں سر ملایا۔

کیا؟ وہ نا سمجھ عورت اس کے لیے راضی ہے؟

ان کا کیا۔ آپ راضی، تو وہ راضی۔ چھوٹے نے کہا۔

میرے پاس اب بچا ہی کیا ہے۔ جو کچھ بچایا تھا، وہ تو میں تم لوگوں کی زندگی بنانے پر لٹا چکا ہوں...اب کیا چاہتے ہو؟ سر پر ایک چھپر ہے، وہ بھی لکھ دوں تم لوگوں کے نام؟ اور میں تمہاری امی کو لے کر فٹ پاتھ آباد کروں؟

نہیں ابو، ویسا نہیں...آپ دستخط کر دیجیے۔ بڑے بیٹے نے کہا۔

کیسے نامعقول ہو تم! میں کیا کہہ رہا ہوں، یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ نہیں؟

طیش میں آجانے سے نور صاحب پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کھانستے ہوئے انھوں نے غصہ اگلنا چاہا، مگر کھانسی سے الفاظ حلق میں اٹک گئے اور بلغم راستہ بناتے ہوئے خارج ہونے کو اتاولا ہو گیا۔ پیک دانی میں بلغم خارج کر کے انھوں نے پھر سے برسنے کی ناکام

کوشش کی۔ بیٹوں نے باپ کا یہ حال دیکھا تو پریشان ہو گئے۔
ابو، ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ...
تم کچھ بھی نہ چاہو تو بہتر ہوگا۔ نور صاحب نے ہانپتے ہوئے کہا۔
آپ دستخط نہ کریں۔ کوئی بات نہیں۔ مگر میری بات تو سن لیں۔ بڑے بیٹے نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔
کہو، کیا کہنا ہے؟
آپ نے ہمیں نیا کاروبار شروع کرنے کے وقت یک مشت بڑی رقم دی تھی قرض دیا تھا کہو۔
جی ہاں۔ درست ہے اور کہا تھا...
میں مکر نہیں رہا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا، وہ آج بھی کہتا ہوں۔ میں نے کہا تھا۔ یہ قرض دے رہا ہوں۔ بغیر سود کے۔ کماؤ تو لوٹا دینا۔
جی، آپ نے بجا فرمایا۔
تو بس۔ اب اور مت مانگو۔ میرے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے۔
ابو، ہم لینے نہیں، دینے آئے ہیں۔
نور صاحب شش و پنج میں پڑ گئے۔ بیٹے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تبھی بڑے بیٹے نے کہا۔
آپ سے لی ہوئی رقم، ہم لوٹانے آئے ہیں۔
نور صاحب لب بستہ ہوئے۔ اور جب بولے تو ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔
ایسی کیا جلدی ہے! پھر اتنی بڑی رقم لے کر میں کیا کروں گا!! بینک میں رکھوں گا، تو سود کی دیمک گھر کو چاٹ جائے گی۔ رقم کاروبار میں رہے گی تو محنت کی فصل کاٹو گے۔
اللہ کے رحم و کرم سے سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔ اس لیے ہماری آپ سے یہ التجا ہے کہ آپ اپنی دی ہوئی رقم قبول فرمائیں اور امی کے ہمراہ حج کو ہو آئیں۔
بے ساختہ نور صاحب کہہ اٹھے۔
میرے مولا!

لبیک کہتے ہوئے سجدۂ شکر میں ماتھا ٹیک دیا۔ جب سجدے سے سر اٹھایا تو ان کے ذہن میں حمد کے بے شمار مصرعے طواف کرنے لگے۔

اردو، فارسی کے سابق لیکچرار نور محمد نوؔر شاعر بھی تھے۔ نوؔر تخلص کرتے تھے۔ پیدائشی لاابالی طبیعت کے مالک نور صاحب چند ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتے تھے۔ قد بھی معمولی سا، بیڑی کے دھوئیں نے دانتوں کے چوکھٹے کو کھنڈر کر دیا تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی سب سے پہلے ان کی ناک نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔ جس پر وہ کبھی مکھی تک بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ بدمزاج تو نہیں تھے۔ البتہ الجھ جلد جاتے تھے۔ جوانی کے دنوں میں، کسی دوست نے آ کر خبر دی۔ نورے، آج رات فلاں فلاں قصبے میں قوالی ہو رہی ہے۔ بس فوراً دو چار کو جمع کیا۔ سائکلیں کرائے پر لیں اور تیں، چالیس میل کا سفر طے کر کے پہنچ گئے محفل قوالی میں۔ خوب داد دیتے۔ خاص طور پر قوال کے اندازِ بیاں اور اس کی اداؤں پر لُٹ جاتے مگر رفتہ رفتہ شاعری کو پرکھنے کی سمجھ شگفتہ ہونے لگی تو اچھے شعر پر جھوم جھوم جاتے۔ کئی کئی روز تک ہم ذوق دوستوں کے ساتھ بحث و مباحثہ چلتا۔ خوش ہوتے تو قہقہہ لگاتے۔ ناموافق بات پر بپھرے گھوڑے کی طرح ہنہنا اٹھتے۔ کبھی کبھی تو سامنے والے سے ترکِ تعلقات بھی کر لیتے۔ ایم۔اے۔ کر کے لکچرار بنے۔ درس و تدریس کے ماحول اور عالموں کی صحبت نے شعر کہنے کی جانب مائل کر دیا۔ چند سالوں کی مشقت اور ریاضت نے مشاعروں میں ان کا نام جانا پہچانا بنا دیا۔

جیسے ہی نور صاحب کا حج جانا طے ہوا تو وہ ہڑبڑا گئے۔ ان پر ایسی عجلت سوار ہو گئی جیسے دو چار روز میں ہی انھیں کسی مہم کے لیے کوچ کرنا ہو۔ سنت کے لحاظ سے حج کے ارکان کیا کیا ہیں؟ دعائیں کون سی ہیں؟ کہاں کہاں کیا پڑھنا ہے؟ ان تفصیلات کے لیے کتابیں فراہم کرنے کی دوڑ دھوپ شروع ہو گئی۔ گذشتہ برسوں میں جو مقامی حضرات حج کر آئے تھے، ان میں شناسا جو تھے ان سے حج کے دوران زنانی کے ساتھ رہنے سے کیا عملی مشکلات پیدا ہوتی ہیں، یہ جانکاری حاصل کرنے ملاقاتیں کی جانے لگیں۔ ایک حاجی صاحب نے بتایا۔ کیا بتاؤں نور بھائی، میں نے جب مکہ معظّمہ کو دیکھا تو مجھ پر ویسی ہی کیفیت طاری

ہوگئی، جیسی حضرت موسیٰ علیہ السلام کوطور پر اللہ کا نور دیکھ کر طاری ہوئی ہوگی۔ میں ہر طرف اللہ کی موجودگی کومحسوس کرنے لگا اور برادر، کیا تعریف کروں میں آبِ زمزم کی!! ہر مرض کی ایک ہی دوا! کتنا بھی پیو پیٹ نہیں بھرتا۔ جی نہیں بھرتا۔ بس پیتے ہی رہو... دوسرے صاحب نے تنبیہاً کہا۔ جناب، وہاں لاکھوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ جیسے پوری دنیا کے لوگ وہاں جمع ہوگئے ہوں۔ پاکستانی، بنگلہ دیشی، ہندوستانی ان کو تو ہم پہچان سکتے ہیں۔ ایک سانچے کے ناک، نقش، ایک ہی جسم کے حصے۔ سنی سنائی زبان۔ مگر دوسرے ممالک کے حاجیوں کی نسل کو دیکھ کر ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس ملک کی مٹی ہے!! ہم ان کی زبان سمجھ نہیں سکتے۔ ان کا لباس، برتاؤ، تہذیب و اخلاق سب اپنی سمجھ سے پرے۔ اس لیے اپنے ناک نقشے والے ہجوم کے دائرے میں رہنا عقل مندی ہوتی ہے... تیسرے حضرت نے فرمایا۔ نور محمد، دوسرے ممالک کے حاجیوں کے سامنے تو ہم جسمانی طور پر بونے نظر آتے ہیں۔ یہ اونچے، تگڑے، مسٹنڈے۔ بے نیازی سے طواف کرتے ہوئے بڑھے چلے جاتے ہیں۔ کسی کو دھکا لگا، کسی کا پیر کچلا، کوئی پورا پس گیا۔ نہیں، کسی کو فکر نہیں۔ فرصت نہیں۔ کوئی شرمندہ ہے، نہ معذرت خواہ۔ اگر کوئی رحم دل افسوس کا اظہار کرنا بھی چاہے تو اس کی بات ہمارے پلّے نہیں پڑ سکتی...

وقت گزرتا رہا۔ کچھ وقت حمد اور نعت کے اشعار سننے میں گزرا۔ کچھ سفر کے خواب تراشنے میں اور کچھ حاجیوں کے ٹریننگ کیمپ میں گزرا۔ اس طرح روانگی کا دن سر پر آ گیا۔ گھر میں گہما گہمی عروج پر پہنچ گئی۔ نور صاحب سوال پر سوال داغے جا رہے تھے۔ یہ لیا کہ نہیں؟ وہ بھولے تو نہیں؟ دیکھ لو کچھ چھوٹا تو نہیں؟ چاول ٹھیک سے پیک کیے ہیں نا؟ آبِ زمزم کے لیے پلاسٹک کی بوتلیں رہ نہ جائیں۔ ورنہ وہاں ریال میں قیمت ادا کرنی ہوگی۔

نور صاحب اس ہڑبونگ کے بیچ ملنے آنے والوں سے ہاتھ بھی ملاتے رہے۔ گلے بھی ملتے رہے۔ پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں میں پیار اور دُلار بھی بانٹتے رہے۔

وقت بھی جیسے اضطراب سے گھبرا کر اپنی سست روی بھول گیا۔ کسی نے آ کر کہا۔ نور محمد صاحب وقت ہوا جا رہا ہے۔

نور صاحب نے بیگم کو آواز دی۔ گھر میں شور مچ گیا۔ بہویں، اہلِ برادری اور محلے کی عورتیں نور صاحب کی اہلیہ سے گلے مل مل کر روتے ہوئے کہنے لگیں۔ ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں ساتھ رکھئے گا۔ نور صاحب کی آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں۔

بیگم نور محمد بیٹے کے ساتھ آٹو میں بیٹھ کر اسٹیشن کے لیے روانہ ہوئیں۔ عورتوں کا ہجوم آنگن میں رک گیا۔ رونا تھم گیا۔ نور صاحب گلی میں پہنچے۔ نعرۂ تکبیر بلند ہوا اور قافلہ مسجد کی جانب چل پڑا۔

نور صاحب اپنی بیگم کے ہمراہ ہوائی اڈے پر بس سے اترے تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔ ریاست کے صدر مقام پر جامع مسجد میں احرام باندھا تو ان کی خوشیوں کو جیسے پر نکل آئے۔ بیگم نے سر پر اپنا دوپٹہ لپیٹ لیا تھا اور وہ بہت خوش رو نظر آ رہی تھیں۔ مگر ہوائی اڈے کی چکا چوندھ سے وہ بوکھلا گئے۔ چاروں طرف انسانوں کا سمندر لہراتا نظر آیا۔ ہر شخص حواس باختہ، ہر کسی کے ہوش گم، ہر کوئی جلدی میں۔ کوئی کسی کو ڈھونڈتا ہوا۔ کوئی کسی کو پکارتا ہوا۔ حج کو جانے والوں سے رخصت کرنے والے زیادہ نظر آ رہے تھے۔ رہی سہی کمی حج کمیٹی کے ممبران اور دیگر انجمنوں کے رضا کار پوری کر رہے تھے۔ بہر حال، ایک افراط وتفریط نقطۂ عروج پر تھی۔

نور صاحب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کریں تو کیا کریں! وہ کس کس کی فکر کریں! بیگم کو سنبھالیں، بانہہ پر حج کمیٹی نے لوہے کا بلّہ، جس پر ان کا کوڈ نمبر اور ملک کا نام کھدا ہوا تھا، ان کی کلائی پر باندھ دیا تھا۔ جو بار بار ان کی سوچ میں خلل ڈال رہا تھا۔ ان کی بیگم گھبرائی ہوئی تھیں۔ نور صاحب کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جنھیں چھپانے کی وہ ناکام کوشش میں مبتلا تھے۔ یہ ان کا پہلا ہوائی سفر تھا۔ دونوں کو جہاز دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ مگر اس افراط وتفریط کے عالم میں وہ اشتیاق کافور ہو گیا۔

اچانک لاؤڈ اسپیکرس پر اعلان ہوا۔ حج کو جانے والے مسافر چیک اِن کریں۔

جہاز کی طرف جانے کا اعلان ہوتے ہی نعرۂ تکبیر گونج اٹھا۔ پھر بھگدڑ مچ گئی۔ ہر کوئی اپنا چھوٹا موٹا سامان سمیٹ کر ہجوم کا حصہ بن گیا۔ دھکم دھکا شروع ہوا تو کسی کا پیر کچلا،

کسی کے کندھے چھلے تو کسی کا اسباب چھوٹ گیا۔ آگے بڑھنے والے کے لیے راستہ ہموار کرو۔ اسے حکم الٰہی ماننے والے، پہلے میں، پہلے کی دھن میں کھو گئے!

ہجوم کی ریل پیل سے بچتے بچاتے نور صاحب اپنی بیگم کو لے کر ہوائی جہاز میں داخل ہوئے تو ان کی جان میں جان آئی۔ دونوں لمحہ بھر کو جہاز کی آرائش دیکھنے کے لیے رُکے۔ تبھی کسی نے پیچھے سے آگے بڑھنے کے لیے انھیں دھکیل دیا۔ وہ اوندھے منہ گرتے گرتے رہ گئے۔ سامنے سے آرہی ایر ہوسٹیس نے ہمدردی اور شفقت سے انھیں تھاما اور کھڑکی والی نشست پر بٹھایا۔ نشست پر بیٹھتے ہی انھوں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے سامان، کمر بند میں رکھے ہوئے ریال، پاسپورٹ اور ہاتھ میں باندھے ہوئے بلّے کا جائزہ لیا۔ سب ٹھیک ٹھاک دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اب جو اللہ یاد آ گیا تو وہ تکبیر پڑھنے لگے۔ اس ادائیگی کا فرض میں ان کی بیگم بھی ساتھ ہو گئیں۔

ہوائی جہاز کی پرواز کا اعلان ہوا۔ سب نے کمر پر سیفٹی بیلٹ باندھ لیے۔ جہاز نے زمین سے رشتہ توڑا۔ بندوں نے رب سے ناتا جوڑا۔ رفتہ رفتہ تکبیر کی پھسپھساہٹ نے روحانی فضا قائم کردی۔ نور صاحب نے نیت عمرہ باندھی اور ''لبیک اللھم لبیک'' کہتے ہوئے ذکر میں مگن ہو گئے۔

علی الصبح جہاز نے جدہ کی سرزمین کو چوما۔ ایک بار پھر تکبیر کی صدا گونجی۔ ہر کوئی خانۂ کعبہ کو دیکھنے کے لیے اتاولا تھا۔ مگر ہوائی اڈّے پر اترتے ہی اکتا دینے والی کاغذی کارروائی شروع ہوگئی۔ عازمین حج کو معلم کے حوالے کردیا گیا۔ جہاں ان کے پاسپورٹ لے لیے گئے اور ان کی کلائی پر پیلا بیلٹ باندھ دیا گیا۔ یہ تمغہ بہت ہی اہمیت رکھتا تھا۔ انھیں تاکید کردی گئی۔ یہ کھو گیا تو آپ لاکھوں لوگوں میں لاوارث ہو جائیں گے۔ آپ کے لیے زبان سب سے بڑا مسئلہ ہوگا۔ آپ کسی کو کیسے کہیں گے، آپ کون ہیں؟ کس مکتب سے وابستہ ہیں؟ کس مکان میں قیام ہے آپ کا؟ زبان رکھتے ہوئے بھی گونگوں کی طرح ہو جائیں گے آپ۔ یہ بیلٹ آپ کا شناخت نامہ ہے۔

دوپہر ہو چکی تھی، جب انھیں رہائش گاہ پر پہنچایا گیا۔ وہ سات منزلہ عمارت تھی۔

ہر کوئی جلدی میں تھا، لفٹ میں سوار ہونے کے لیے۔ پھر ایک مرتبہ پہلے میں، پہلے میں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب تو پورا سامان سفر بھی ان کے ساتھ تھا۔ نور صاحب سے سامان سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ گاؤں میں بیٹوں نے سامان سنبھال لیا تھا۔ ایر پورٹ پر حج کمیٹی نے اور یہاں معلم کے آدمیوں نے اس کی دیکھ بھال کی تھی۔ اب جب سارا بوجھ ان کی بوڑھی ہڈیوں پر آن پڑا تو وہ پریشان ہوگئے۔ من ہی من گھر والوں کو کوستے ہوئے بڑبڑائے۔ اتنا سارا سامان باندھنے کی کیا ضرورت تھی!! میں حج کرنے آیا ہوں نہ کہ حمالی کرنے...

نور صاحب ہاتھ منھ دھو کر جلدی سے تیار ہوگئے۔ وہ عمرہ کے لیے خانہ کعبہ پہنچنے کی عجلت میں تھے۔ دورانِ سفر جس جلد بازی کا مظاہرہ انھوں نے دیکھا۔ ''پہلے میں، پہلے میں'' کے عمل کو جھیلا اور بھوگا اس سے ان کے نہاں خانۂ دل میں لاشعوری طور پر ایک خوف پیدا ہوگیا۔ کہیں میں رہ نہ جاؤں! اس جذبے کے زیرِ اثر وہ بیگم کے ہمراہ کسی کو کہے بغیر نکل پڑے۔

بیگم کے گھٹنوں میں گٹھیا کی شکایت تھی۔ وہ آہستہ آہستہ طواف کریں گی۔ بیگم کے ساتھ چلنے میں صبر کی آزمائش ہوگی۔ یہ سوچ کر انھوں نے بازار سے سات دانوں والی تسبیح بیگم کو دلا دی تاکہ طواف کے سات چکر کی گنتی میں بیگم سے غلطی نہ ہو جائے۔

آٹھ ذی الحجہ کو ابھی کچھ دن باقی تھے۔ خانۂ کعبہ میں طواف کرنے والے عازمین حج کی اتنی بھیڑ نہیں تھی۔ دونوں نے پاک پروردگار کی بڑائی کا بیان کرتے ہوئے خانۂ کعبہ کا طواف شروع کردیا۔ طوفانی سمندر کی لہروں کی طرح ان کے جذبات اٹھان پر تھے۔ ان کا پورا وجود جذبۂ بندگی سے شرابور تھا۔ وہ عالمِ بے خودی میں کہے جا رہے تھے: سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول والا قوۃ الا باللہ...

نور صاحب کچھ دیر تک بیگم کی آہستہ روی کا ساتھ دیتے رہے۔ مگر پھر ''پہلے میں، پہلے میں، کی رفتار سے ثواب بٹورنے آگے نکل گئے۔

نور صاحب نے طواف کے سات چکر مکمل کر لیے۔ انھیں بیگم کا خیال آیا تو ایک

طرف ٹھہر کر طواف کرنے والوں میں انھوں نے بیگم کی تلاش شروع کردی۔ کافی وقت گزرنے کے بعد انھوں نے انھیں دھیمی چال سے آتے ہوئے دیکھا۔ وہ قریب آئیں تو معلوم ہوا، ابھی دو چکر باقی ہیں۔ وہ بیگم سے اتنا ہی کہہ سکے۔ میں یہیں انتظار کروں گا۔ بیگم رکی نہیں۔ نور صاحب کو سوچ میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئیں۔ وہ سوچتے رہے، اب کیا کریں۔ بیگم کی رفتار کو دیکھتے ہوئے انھیں یقین ہو گیا۔ سات چکر مکمل کرنے میں انھیں کم از کم پچیس سے تیس منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔ وہ پلٹے۔ قریب کے گلیارے میں آئے۔ وہاں قطار میں نل کی ٹوٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ جس کے پانی کی ایک بوند سے جنت پا جانے کی امید میں مسلمان زندگی کی ہر مشکل جی جاتا ہے، وہ آبِ زمزم یہاں اللہ کی رحمت بن کر ٹوٹیوں سے بہہ رہا تھا۔ نور صاحب نے منہ ہاتھ دھوئے، کلی کی۔ ترو تازہ ہو کر نل سے بندھے مگ سے آبِ زمزم پی کر مسرور ہوئے۔ مگر تسلی نہیں ہوئی۔ بہ مشکل ایک گلاس پانی پینے والے نور صاحب ثواب کی آس میں پانچ، چھ مگ آبِ زمزم غٹ غٹا گئے۔ پیٹ پھول گیا۔ کسی پہلو بیٹھنا دشوار، ٹھہرنا مشکل اور چلنا دوبھر ہو گیا۔ وہ الجھن میں پڑ گئے۔ اپنی پریشانی کس سے کہیں۔ اطراف میں ان کی زبان سمجھنے والا کوئی نظر نہیں آیا۔ تبھی انھیں خیال آیا، اللہ تعالیٰ ان کی زبان جانتا ہے۔ وہ ہر زبان جانتا ہے۔ وہ صحت کے لیے دعا کرنے لگے۔ آٹھ، دس منٹ گزرے ہوں گے کہ انھیں ایک ڈکار آئی، کچھ وقفے کے بعد وہ دوسری اور تیسری ڈکار پر تو پیٹ ہلکا اور طبیعت صاف ہو گئی۔ ذہن سنبھلا تو بیوی یاد آئی۔ مگر بیوی کے پاس جانے سے پہلے چلو پھر آبِ زمزم پینے سے وہ اپنے آپ کو روک نہ سکے۔

دو رکعت نماز کی نیت باندھنے سے پہلے نور صاحب نے کپکپاتے ہوئے اپنی بارگاہ میں دونوں کو ایک ساتھ بندگی کرنے کا موقع عطا فرمانے والے مالکِ دوجہاں کا شکریہ ادا کیا۔ دونوں نے دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر صفا اور مروہ کے سات چکر لگا کر سعی سے فراغت حاصل کرلی اور حلق کے لیے بیٹھ گئے۔ سر کے بال منڈوانے کے بعد نور صاحب کا چھوٹا چہرہ اور چھوٹا نظر آنے لگا۔ بعد حلق کے احرام اترا تو پاجامہ، کرتے میں ان کا بدن اور بھی ہلکا ہو گیا۔

دوسرے دن صبح نور صاحب مکہ مکرمہ پہنچے۔ کل سے آج طواف کرنے والوں کی بھیڑ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ انھوں نے دل ہی دل میں کہا۔ اللہ میرے، آج یہ عالم ہے، تو طوافِ زیارت کا کیا منظر ہوگا!! وہ اس ہجوم کا حصہ بننے کا حوصلہ نہیں جٹا پائے۔ اس لیے وہ بالائی منزل پر پہنچے۔ یہاں نیچے کی بہ نسبت لوگ کم تھے۔ یہاں بھی جگہ جگہ پر نل لگے ہوئے تھے۔ ان کا جی چاہا، آبِ زمزم پیا جائے۔ پھر یہ سوچ کر ٹال گئے کہ طہارت کی حاجت ہوئی تو؟... انھوں نے یہ خواہش بعد طواف پر ملتوی کردی۔

آج وہ جی بھر کر مسلسل طواف کرنا چاہتے تھے۔ مغرب تک کی تینوں نمازیں یہیں پڑھنا طے کر کے آئے تھے۔ کیونکہ حدودِ حرم میں ایک نماز کے عوض ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔ وہ یہ موقع گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ ویسے بھی آج بیگم کی فکر دامن گیر نہیں تھی۔ بیگم کے گھٹنوں میں درد تھا۔ انھیں حرم میں ایک جگہ پر تسبیح خوانی کے لیے بٹھا آئے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے ہوئے انھوں نے طواف شروع کیا۔ دعا پڑھتے ہوئے طواف میں بڑھتے چلے گئے۔ دوسرے چکر میں داخل ہوتے ہوتے رشتہ داری، خانہ داری اور دنیاداری سب بھول کر اللہ سے لو لگالی۔ اللہ ہی اللہ، صرف اللہ۔ وہ دعا پڑھتے رہے۔ پانی کے ریلے کی طرح بڑھتے رہے۔

ایک طرف گٹھیا کے درد سے لاچار و بے بس بیگم نور محمد تسبیح خوانی کے سہارے راہِ نجات پر گامزن تھیں۔ دوسری جانب نور محمد ثواب بٹورنے کے جنون میں رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ایک کا عقیدہ مستقل مزاج گہرے دریا جیسا تھا۔ دوسرے کا باڑھ آئی ندی کے پانی جیسا۔ ایک مطمئن تو دوسرا عجلت میں تھا۔ مگر منزل دونوں کی ایک ہی تھی۔

نور صاحب مسلسل طواف جاری رکھے ہوئے تھے۔ اب ان کی چال میں پہلی سی رفتار نہیں تھی۔ بھوک، پیاس تو ان کے بس میں تھے۔ مگر ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ تیسرے طواف کے چوتھے رکن میں داخل ہوئے تو انھوں نے سوچا، یہ طواف مکمل ہوتے ہی اب رکنا چاہیے۔ اس لیے یہ دعا پڑھنا شروع کردی: رَبَّنَا اٰتِنَا ... اے اللہ تو ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کرے اور آخرت میں بھی۔ اور ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا اور ہمیں

نیک لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل فرما۔

طواف مکمل کر کے وہ رکے۔ جنون تھا تو چند قدم چلنا تو در کنار ٹھہرنا بھی مشکل ہو گیا۔ حلق خشک، جسم پسینے سے تر بہ تر، آبِ زمزم کی ٹونٹیوں تک پہنچنے کی سکت بھی وہ جٹا نہ پائے۔ گلیارے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی دو، ڈھائی فٹ اونچی دیوار کے سہارے کچھ لوگ ستا رہے تھے۔ چند لمحے ستا کر آبِ زمزم پینے کا ارادہ کر کے جسم کو گھسیٹتے ہوئے دیوار کے قریب پہنچے۔ کسی بیمار کی مانند پاؤں سکوڑ کر بیٹھے۔ کہنیاں زمین پر ٹکائیں اور دیور سے تکیہ کیا۔ پل دو پل میں انھوں نے محسوس کیا، جیسے ان کا جسم جھلس رہا ہے۔ منڈے ہوئے سر پر انگارے برس رہے ہیں۔ انھوں نے دیکھا، اوپر کے روشن دان سے دھوپ کا ٹکڑا ان پر شعلے برسا رہا ہے۔ کچھ پریشان ہوئے۔ سوچا، چند لمحے ہی تو ستانا ہے۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ بائیں جانب ایک افریقن نسل کا ہٹا کٹا نوجوان قرآن مجید پڑھنے میں مشغول ہے۔ دائیں طرف مغربی نسل کا ایک ضعیف بزرگ تسبیح پڑھتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر امسکرا رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی بولی سمجھنے سے معذور تھے۔ نور صاحب نے اس کی مسکراہٹ کے جواب میں خالص ہندوستانی انداز میں آداب کیا۔ بزرگ کے ردعمل سے ظاہر ہو رہا تھا، یہ طور طریقہ اس کی سمجھ کے باہر ہے۔ وہ تسبیح پڑھتے رہے۔ نور صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔ رفتہ رفتہ ان کے ذہن میں ہلچل پیدا ہونے لگی۔ وہ سوچنے لگے۔ ابھی ابھی میں دعا کر رہا تھا، کہ اے اللہ مجھے جہنم کے عذاب سے بچا اور نیک لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل فرما... مگر میں نہیں جانتا مجھ سے کتنے گناہ سرزد ہوئے ہیں!! میرے پاس اس کا کوئی حساب نہیں ہے۔ اللہ تو میرے گناہوں سے واقف ہے۔ تیرے پاس میری نیکی بدی کا پورا حساب ہے۔ کیا منھ دکھاؤں گا میں تجھے!! جانے قیامت میں میرا کیا حشر ہوگا...!

وہ سوچ کی بھیڑ سے گھبرا گئے۔ قیامت کا خیال آتے ہی کانپ اٹھے۔ قبر کے تصور سے ان کا دم گھٹنے لگا۔ وہ بُد بدائے۔ اے اللہ، تو بڑا رحیم ہے۔ میں جانتا ہوں، میں ان چالیس دنوں میں حرم شریف کے کتنے بھی طواف کر لوں، کتنی بھی نیکیاں کر لوں، حج میں کتنی

بھی بڑی قربانی دوں، مسجد نبوی میں چالیس نمازیں ادا کروں یا منیٰ میں سجدے کروں پھر بھی میری زندگی بھر کے گناہوں کے مقابل میرا یہ ثواب اور نیکیاں نہ کے برابر ثابت ہوں گی۔ میں گنہگار ہوں۔تو مجھے معاف کر۔تو بڑا رحیم ہے۔مہربان ہے۔کرم فرما ہے۔ مجھے جینے کی کچھ اور مہلت عطا فرما۔ تاکہ میں بڑی عبادت کر کے، نیکیاں جمع کر کے زندگی کا حساب ٹھیک کرسکوں...قلب کی پاکی اور اخلاق کی اصلاح یہاں نہیں ہوگی تو پھر کہیں نہیں ہوسکتی۔

وہ جینے کی مہلت کے لیے گڑگڑاتے رہے۔ان کی آنکھوں سے آنسو امڈ آئے۔تبھی اچانک کچھ چبھتا ہوا ان کے کندھے کے قریب سے گزر گیا۔انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ پاس میں بیٹھا نوجوان ان کے سر کے قریب دیوار پر قرآن رکھ رہا تھا۔شاید اسی کا ہاتھ کندھے کو چھوتا ہوا نکل گیا تھا۔

نور صاحب کی بڑبڑاہٹ اور لاشعوری حرکات سے کچھ پریشان، ان کے دائیں، بائیں بیٹھے دونوں حاجی انھیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔نور صاحب پسینے میں شرابور تھے۔ ایک طرف شدّت کی دھوپ اور دوسری جانب بے انتہا پیاس اور تھکن نے انھیں اس قدر نڈھال کر دیا تھا کہ حرکت کرنا بھی ان کے لیے مشکل تھا۔روشن دان سے آتی ہوئی دھوپ سے پریشان ہوکر اپنے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کر لیتے،کبھی اپنے چہرے سے پسینہ پونچھتے اور اپنے سوکھے ہوئے حلق کو تر کرنے کے لیے تھوک نگلنے کی ناکام کوشش کرتے۔ اس عذاب سے بچنے کے لیے نہ طاقت تھی اور نہ حوصلہ۔

اچانک پینے سے تر نور صاحب کے جسم کو ہوا کے ہلکے سے جھونکے نے خوش گوار ٹھنڈک کا احساس دلایا۔ جیسے جنت نصیب ہوگئی۔انھوں نے دیکھا، آگ اگلتے اس دھوپ کے ٹکڑے اور ان کے درمیان کوئی کالی چٹان سی چیز حائل ہوگئی ہے۔غور سے دیکھا،تو حیران رہ گئے۔وہ افریقن نسل کا نوجوان اس دھوپ کو اپنے جسم پر لیے ہوئے کھڑا تھا۔تبھی پاس میں بیٹھے بزرگ اللہ کہتے ہوئے، گھٹنے پر ہاتھ ٹیکتے ہوئے، دوسرے ہاتھ سے دیوار کے اوپری حصے کو پکڑ کر کراہتے ہوئے یا ربی کہہ کر بڑی مشکل سے اٹھے اور ناک کی سیدھ میں رینگتے ہوئے چل دیے۔

نور صاحب نے ان دونوں حضرات پر خاص توجہ نہیں دی۔ کچھ دیر بعد انھیں اچانک احساس ہوا، ان کے روبرو کوئی ہے۔ آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ سامنے وہ بزرگ اپنی وہی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے کانپتے ہاتھ میں آبِ زمزم سے لبریز گلاس تھا۔ بزرگ نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ نور صاحب نے گلاس لے کر ہونٹوں سے لگایا۔ خشک حلق تر ہو گیا تو جیسے ان پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اب انھیں پتہ چلا کہ اس نوجوان حاجی نے دھوپ کے ٹکڑے کو اپنے اوپر لے کر ان تک چھاؤں کیوں پہنچائی! اس بزرگ حاجی نے ان کی پیاس بجھانے انھیں آبِ زمزم کا پیالہ کیوں لا کر دیا! اجنبیت کے باوجود ان دونوں کی یہ ہمدردی، اخلاص اور جذبۂ خدمت سمجھ میں آئے تو بے ساختہ سبحان اللہ، جزاک اللہ کہتے ہوئے نور صاحب اٹھے۔ دونوں کے ہاتھوں کو باری باری چوم کر پیشانی سے لگایا اور بولے۔ سچ ہے، نیکی کا قد ناپا نہیں جا سکتا۔ مگر اعمال کے سچے پر خلوص جذبے، بے لوث خدمت اور پاک نیت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

وہ دونوں نور صاحب کی بات سمجھ نہیں سکے۔ مگر ان کی نم آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں کو دیکھ کر قدرے مسکرائے۔

نور صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ میرے اللہ، مجھے اور جینے کی مہلت دے نہ دے مگر دوسروں کے درد اور تکلیف کو محسوس کرنے والے ان دونوں کے اس اخلاص جیسی نیکی کرنے والا جذبہ مجھے بھی عطا کر دے۔ آمین!

(بشکریہ: شاعر، فروری ۲۰۰۴ء)

قطب مینار

میں دروازے کے اندر داخل ہوا تو سامنے قطب مینار تھا جو قوت الاسلام مسجد کا ایک ایسا بچا ہوا انگ ہے جو کافی حد تک سالم ہے۔ مسجد کا باقی جسم کئی صدیوں سے گزرنے کے دوران کمزور ہونے کی وجہ سے گرتے گرتے لگ بھگ کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا تھا۔

اسی احاطے میں گھومتے ہوئے مجھے وہ ادھورا مینار دکھائی دیا جو تودے کی شکل میں تھا۔ یہ مینار علاؤالدین خلجی نے بنوانا شروع کیا تھا۔ اس کے ذہن میں ابھر کر آسمان چھوتا ہوا تصور پوری طرح مجسم ہونے سے رہ گیا تھا۔ لیکن یہ سین آم کی کسی ایسی گٹھلی کی طرح لگ رہا تھا جس میں انکورا ایسی لمبی سانس روکے اس موسم کے انتظار میں ہو جو اس کی معنویت اور چہرے کو پہچانتا ہو۔

وہ تودہ سا مینار وہاں جوں کا توں تھا، جب کہ اس کے روبرو کھڑے قطب مینار کا اوپری حصہ ٹوٹ کر کہیں تاریخ کے ملبے میں گر گیا تھا۔ یہ نامکمل مینار جس کا قد صرف ساڑھے چوبیس میٹر ہے، اس کے نقشے کا تصور کرتے ہوئے اس کی اندرونی عظمت ہمارے تخیل کے اندر آسمان چھوتی ہے۔

میں وہاں سے باہر سڑکوں پر آیا تو کچھ بدل گیا تھا۔ مجھے بار بار یہ احساس ہونے لگا کہ میرے اندر بھی تودہ کی طرح کوئی چیز موجود ہے۔ کچھ دنوں بعد یہ احساس شدت اختیار کرنے لگا اور میں اس پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ میرے اندر موجود اس تودے میں اور قطب مینار کے احاطے میں موجود اس تودے میں کوئی مماثلت تھی اس لیے میں اپنے اندر کے اس معاملے کو سمجھنے کے لیے اس تودے کے معاملے پر ذہن کو مرکوز کر کے غور کرنے لگا کہ جس معمار نے اس مینار کا نقشہ بنایا ہوگا اس نے اپنے سامنے ایک عریض وطویل کینوس بچھایا ہوگا اور اس پر ایک پتھر سے دوسرے پتھروں کے جڑنے کے امکانات کو مدنظر رکھتے

ہوئے ایک ایسی تصویر بنائی ہوگی جس کا پتھروں کے جسم میں وجود میں آنا عین ممکن تھا۔

تو کیا وہ نقشہ بھی ادھورا تھا؟

علاؤ الدین خلجی کی اچانک موت اور کسی بادشاہ کے اس بلندی کے تصور تک نہ پہنچ پانے کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ یہ نقشہ ادھورا تھا۔

جس معمار نے نقشہ بنایا ہوگا اس کے دل کو ایک چوٹ ضرور لگی ہوگی اور اسے محرومی کا احساس ضرور ہوا ہوگا کہ علاؤ الدین خلجی کی موت اس کے تصورات کو کیسے مسمار کرگئی۔ اس معمار کی محرومی میں اور میرے اندر موجود زخم کے اس ٹیس میں کیا کوئی فرق ہے جو ٹیس مجھے بار بار تلملا دیتی ہے۔

میرا جسم اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک ایسا قطب کمپلیکس بن گیا ہے جس میں سربلند میناروں کے ساتھ ساتھ بے شمار تودوں کے نقشے بنانے والے معمار مایوس فقیروں کی طرح بیٹھے ہیں اور ان کے ہاتھ آسمان کی طرف دعاؤں کے لیے اٹھے ہوئے ہیں۔ یہ تودے معنی کا لباس پہننے کے لیے بے قرار ہیں۔

میں اب تودوں کو نہ کھوٹا ماننے کے لیے تیار ہوں نہ ادھورا۔ یہ تودے وقت کی زمین میں پڑے ہوئے وہ بیج ہیں جو مناسب موسموں میں پیڑ بن کر وقت ہی کی پہاڑیوں پر لہلہاتے ہیں۔ اسی احاطے میں جو مینار مکمل شکل میں دکھائی دیتا ہے یعنی قطب مینار وہ مکمل، قابل دید اور جیتا جاگتا ہے اور اس کی تصویریں لی جاتی ہیں، لیکن درحقیقت اب اس کے اندر دیکھنے کو بچا ہی کیا ہے۔ دیکھنے کو جو کچھ بچا ہے وہ تو اس تودے کے اندر پوشیدہ ہے جو ابھی سامنے نہیں آسکا، لیکن جو اپنے اندر ہاتھی کے پاؤں جیسے حوصلے لیے کھڑا ہے۔

مجھے لگنے لگا کہ نامکمل رہ جانا مکمل ہونے سے زیادہ اہم بات کی نشان دہی کرتا ہے۔ مجھے وہ لوگ سطحی لگنے لگے جو تکمیل کو ہی کامیابی کی نشانی سمجھتے ہیں۔ مجھے لگا کہ لوگ میری ذات کو بھی اسی طرح دیکھتے ہیں۔ وہ میری نوکری، میرے گھر، میری اور کئی چیزوں کا، جو مجھے حاصل ہوئی ہیں، ذکر کرتے ہیں۔ لیکن میرے اندر جو تودہ ہے اس کا کوئی ذکر نہیں۔ وہ خاموش بھی ہے اور نظروں سے اوجھل بھی۔ وہ کھردرا بھی ہے اور بدہیئت بھی۔ لیکن وہ

ان سب باتوں کے باوجود ذات سے ابھرنے والی ہر چیز کی ان داتا کوکھ کی طرح ہے۔
میری زندگی کے سب مینار پتھروں کے ہیں۔ لیکن یہ تودہ زندہ ہے اور مسلسل بڑھتا اور پھلتا پھولتا رہتا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ قطب مینار ایک ایسی پُر فریب حقیقت ہے جو طوفانوں سے ٹوٹ کر گر جاتی ہے اور اس کی مرمت کرنی پڑتی ہے۔ اسی لیے ہر چند کہ آپ کے سامنے جو مینار ہے اس پر آسمانی آیتیں لکھی ہوئی ہیں اور میرے اندر کا تودہ بے لباس ہے، لیکن میرا بے لباس ہونا میرے اندر موجود امکانات کی گواہی دیتا ہے۔
قطب کمپلیکس کا احاطہ میرے جذبہ ارتقا کے لیے نشانِ راہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا، اینٹ اور پتھروں سے کھیلنے والے معمار بھی کبھی کبھی جانے انجانے کچھ کچھ ایسا چھوڑ جاتے ہیں جو کبھی مینارِ نور کی صورت میں ہماری رہ نمائی کرتا ہے اور کبھی ملبہ امکان کی صورت میں ہمیں متحرک کرتا ہے۔ میں وہاں سے نکل کر دلّی کے گلی کوچوں میں گھومتا ہوا میناروں اور ادھورے جسموں، دونوں قسم کے لوگوں کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اس سے میں دھیرے دھیرے اپنے بہت سارے دوستوں سے کٹتا چلا گیا۔ خصوصاً ان سے جن کو میرا تنہا بیٹھے کچھ کچھ سوچنا اٹ پٹا سا لگتا تھا۔ ان کو میں نے دیکھا کہ وہ ہر بات کو کھنکھناتے سکوں کے الفاظ میں سننا چاہتے تھے۔ جو بات صرف لکھی جاسکتی ہو، اس کا ان کے نزدیک گویا کوئی وجود ہی نہیں۔ یہ سوچ ایک وبا بن چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ پتھروں کے ترشے ترشائے ٹکڑوں کی قیمت مقرر ہے، لیکن تودے کی کوئی قیمت نہیں۔ ایسے میں ناکامیوں کی قدر و قیمت کو پہچاننے والے جوہری چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔
میں نے ان دِنوں میں یہ دیکھا کہ تمام دیے بجھے پڑے ہیں۔ عظیم رہ نماؤں کے تصور کو غیر حقیقی بات سمجھ کر رد کیا جاچکا ہے۔ بڑے بڑے ذمہ دار افراد بھی اب محض قطب مینار بننے کے چکر میں گرفتار ہیں۔ ہر اونچا اور کامیاب شخص پتھر کے ٹکڑوں پر اپنا نام لکھوانے میں مصروف ہے اور ان کی آنکھوں کے سامنے آزادی برصغیر کی قوت الاسلام مسجد ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہے اور داہنی طرف وہ جگہ خالی ہے، جہاں کبھی ایک تودہ ہوا کرتا تھا۔
میرے ذہن وروح پر ایک سوال کوڑے کی طرح برستا رہا کہ کیا کوئی علاؤالدین

خلجی اب پیدا ہوگا؟ کوئی جو بڑے خواب دیکھ سکے اور جو اس خواب کی تعبیر کا آغاز کردے۔ اس بے حد حقیقت پسند دنیا میں —— قطب مینار سے تین گنا اونچا —— اور کم از کم ایک ملبہ ہی چھوڑ کر مر جائے۔

سوال اٹھتے رہے۔

کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہم سب ناکامیوں سے ڈرتے ہیں؟

محض اس لیے کہ کوئی ناکامیوں کی تصویریں نہیں لیتا...اور ہم سب کچھ تصویریں کھنچوانے کے لیے کرتے ہیں؟

ہمیں ہمارے اندر کا کوئی درد پریشان نہیں کرتا بلکہ ہم باہر کے کیمروں کے تقاضوں سے پریشان ہو اٹھتے ہیں۔

اور کیمرے ہیں کہ امکانات کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔

مجھے لگا کہ ہماری مہم جوئی میں کچھ کمی ہے۔ ہمارے یہاں کی سیاحت گری میں کچھ کھوٹ ہے۔

ہماری نگاہیں تکمیل کی تلاش میں رہتی ہیں اور ان چیزوں کو قطعی نہیں دیکھتیں جو اپنے اندر بڑی بڑی دھڑکنیں دبائے بیٹھی ہیں۔ اس سے تاریخی معاملات کے بارے میں اندازہ لگانے میں بھی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ کیوں کہ جو کچھ تو دہ رہ گیا وہ ابھی تاریخ کا حصہ نہیں بنا ہے اور وہ کسی بھی وقت ابھر کر سامنے آ سکتا ہے اور حقیقت میں سرگرمِ تخلیق انکوروں جیسے ان تودوں کا خاتمہ ممکن ہی نہیں کیوں کہ وہ تو معماروں کے ذہن کی پیداوار ہیں اور معماروں کے ذہن خاموشی کے ساتھ اپنے علاؤ الدین کے انتظار میں رہتے ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ طوفانوں سے قطب مینار ٹوٹ کر گرتے تو ہیں، لیکن اگر کوئی ان تودوں کو توڑ پھوڑ کر ان کے ٹکڑوں کو ادھر ادھر بکھیر دے تو بھی معمار ذہنوں پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا کیوں کہ ان کی جبلت مسلسل متحرک اور زندہ رہتی ہے۔

مجھے لگا کہ ہم زوال کا شکار ہیں۔ یہاں جہاں سیاست دانی سیاست بازی میں بدل

گئی ہے، دنیا کے بڑے بڑے مذہب زندگی کی بازی کے مہرے بن گئے ہیں، جہاں بادشاہ موقع ملنے پر پیدل کی چال چلنے میں بالکل نہیں ہچکچاتے۔ جہاں بونا ہونا آئیڈیل بن گیا ہے اور جہاں علاؤ الدین خلجی کی طرح آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنے کا کسی کو شوق نہیں ہے۔اسی ماحول کا پیدا کردہ ہے وہ درد جو میں اپنے اندر کے تودے میں محسوس کر رہا ہوں۔

اس دن کے بعد جس دن میں اچانک قطب کمپلیکس میں داخل ہوا تھا تو سامنے قطب مینار تھا، میں کئی بار اس تودے کی زیارت کو جا چکا ہوں کیوں کہ اس سے میرا قطب کمپلیکس منور ہوتا ہے۔لیکن چندروز پہلے جو کچھ ہوا وہ میں آپ کو بتاؤں گا— ہوا یہ کہ اس دن جب میں اپنے کچھ مہمانوں کے ساتھ قطب کمپلیکس میں گیا تو مجھے لگا کہ قطب مینار تو اپنی تکمیل کو پہنچ کر اپنے زوال کا انتظار کر رہا ہے۔ یہ میرے لیے ایک عجیب وغریب احساس تھا۔

گیٹ کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی میری نگاہوں کے سامنے کا سارا منظر بدل گیا تھا اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ میرا کیمرہ بیکار ہی میرے کندھے پر لٹک رہا ہے۔ کیوں کہ اب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کے لیے کیمرہ کی نہیں قلم کی ضرورت تھی۔ میں پیچھے مڑ کر وہ کیمرہ گاڑی میں رکھ آیا۔اس کے بعد کافی دیر تک ہم لوگ قطب کمپلیکس میں گھومتے رہے۔

وہاں سے آنے کے بعد میں اپنے ماحول میں ٹٹول ٹٹول کر چھونے کی کوشش کرتا ہوں اس معمار کو جو لامتناہی فضاؤں میں مسلسل بنتے بگڑتے میناروں کے ڈرافٹ بناتا ہے۔

اور میری سیاحت گری میں تبدیلی آگئی ہے۔اب میرے کندھے میں کیمرے کے بجائے ایک چھوٹا سا تھیلا لٹکتا ہے جس میں ایک نوٹ بک ہے اور ایک ننھا سا قلم ہے جو داہنے، بائیں دونوں جانب سے روانی سے چلتا ہے اور مسلسل اس معمار کی تصویر بناتا ہے جو ہے تو لیکن پتہ نہیں کدھر ہے۔

(مصنف کی کتاب ''مافیا'' سے ماخوذ)

غضنفر

بالیشور
(۱۸)-اٹھارھواں ادھیائے

بالیشور کی بند آنکھوں میں ہَوَن کا ایک ایک منظر سمٹ آیا۔ آگ دھدھکنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے منوں اناج اور گھی تیل راکھ اور دھوئیں میں تبدیل ہو گئے۔

اناج کی یہ راکھ پہلے بھی اس کے ذہن میں چبھتی رہی تھی۔ گھی تیل کا یہ دھوان دماغ میں گھس کر اسے بے چین کرتا رہا تھا۔ مگر آج وہ اسے کچھ زیادہ ہی پریشان کر رہے تھے۔

اناجوں کا جلنا اسے اچھا نہیں لگا۔ پہلے گھی تیل کا دھوئیں میں بدلنا اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔

کیا سچ مچ انھیں دیوتا کے لیے جلایا جا رہا تھا؟

کیا دیوتا اتنے بھوکے ہیں کہ انھیں منوں اناج چاہیے؟

کیا دیوتا کی پیاس ایسی ہے کہ بنا گھی تیل پیے نہیں مٹتی؟

اتھوا اس انّ دہن اور تلہن داہ کے پیچھے کوئی اور بات ہے؟....

کوئی بھید؟ کوئی رہسیہ؟...

اس نے سوچنا شروع کیا تو ایک اور سوال ابھر آیا

کھادیہ سامگری کا مول کاریہ کیا ہے؟

جواب ملا۔

شریر میں اُرجا اُتپن کرنا تھا انگوں کو گتی پردان کرنا

یدی شریر کو کھادیہ سامگری کم ملے تو کیا ہوگا؟

اُرجا کم بنے گی۔ گتی دھیمی ہو جائے گی

سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اُرجا کم اور گتی دھیمی ہونے پر کیا ہوگا؟

شریر دربل ہو جائے گا۔ مستِشک کام کرنا بند کر دے گا

کمزور جسم اور بے دماغ کا ایک آدمی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ دیر تک بالیشور کی نظریں اس پر ٹکی رہیں

یدی شریر کی مانگ کے برابر کھادیہ سامگری دیا جائے تو؟

اُرجا ادھیک بنے گی۔ گتی بڑھ جائے گی۔

تو کیا ہوگا؟

شریر ہشٹ پشٹ اور مستِشک وِکست

ایسا ہونے سے کیا ہوگا؟

منشیہ کسی دباؤ میں نہیں آئے گا۔ کوئی اس پر اپنی اچھا نہیں تھوپ سکے گا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ اُرجا کم اور گتی کو دھیمی کرنے کے اُدّیشیہ سے ہون کا آوِشکار ہوا ہو؟

پرنتو کیوں؟

تا کہ منشیہ کو دبایا اور جھکایا جا سکے۔ اس پر اپنی اچھا تھوپی جا سکے۔ اسے اپنے بس میں کیا جا سکے۔

بالیشور کا ذہن آخری جواب پر مرکوز ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں انسانی استحصال کے کسی پراسرار منصوبہ کے تانے بانے ابھرنے لگے۔ خود غرضی کی تکمیل کے لیے رچی گئی کسی طلسمی سازش کے خط و خال دکھائی دینے لگے۔

مانو بھن کی اتنی بڑی یوجنا! سوارتھ سِدھ کرنے کا ایسا شڑینتر۔

بالیشور اس منصوبہ اور سازش پر محو حیرت تھا کہ ایک اور منظر ابھر آیا۔

خون پسینے سے اگائی گئی فصل سے بھگوان نام کا ایک حصہ فصل اگانے والوں نے خود اپنے ہاتھوں سے الگ کر دیا۔

ہو سکتا ہے، پرنتو اپنا پیٹ کاٹ کر فصل کا ایک حصہ دچھنا کے نام پر دینے اور کھادیہ سامگری کو آگ میں جھونکنے پر لوگوں کو تیار کیسے کیا گیا ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں جوگیشور کی ناٹک منڈلی کے ذریعے کھیلا گیا ناٹک ایک

بار پھر اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا۔
برہما کے مختلف اعضا سے پیدا ہونے والے انسان ایک ایک کر کے ابھرنے لگے۔
بالیشور کو اپنی سوچ کا نتیجہ اطمینان بخش لگا۔ اسے ہون آیوجن کرنے والے اور اس میں کھادیہ سامگری ڈالنے والے دونوں پر غصہ آنے لگا۔
اس کے غصے کے شعلے آہستہ آہستہ برہما کی طرف بھی لپکنے لگے۔

(۱۹)

اس دن کے بعد بندیا کا رنگ نکھرتا گیا۔ اس کے چہرے کی چمک بڑھتی گئی۔ اس کے جسم کی خوشبو میں اضافہ ہوتا گیا۔
بالیشور اس کے لیے بے چین رہنے لگا۔ اس کی جدائی اسے کھلنے لگی۔ بندیا کا وجود بالیشور کے لیے ایسا ناگزیر ہو گیا کہ اس کے لیے ایک دن وہ سیدھے اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا۔
''ماں! میں بندیا سے وواہ کرنا چاہتا ہوں۔''
''کون بندیا؟'' ماں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔
''وہی بندیا جو کبھی ہمارے گھر کام کرتی تھی۔''
بندیا کی اصلیت معلوم ہوتے ہی ماں کی آنکھوں میں حقارت اور نفرت کا ملا جلا تاثر ابھر آیا۔ وہ اپنی آواز میں ناپسندیدگی کا انداز لاتے ہوئے بولی:
''کیا ہمارے کل میں تمہارے یوگیہ کوئی لڑکی نہیں ہے؟ کیا اِدھر کی ساری لڑکیاں مر گئی ہیں جو تم اُدھر کی چھوکری کو گھر میں ڈالنا چاہتے ہو؟''
''ماں! بندیا میری پریمیکا ہے اور پریمیکا کا کوئی چھیتر نہیں ہوتا۔ اس کی کوئی جات نہیں ہوتی۔ کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ پریمیکا کیول پریمیکا ہوتی ہے۔ اور ایک بات اور بھی ہے ماں!''
''وہ کیا؟''
''وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔''
''تو کیا ہوا؟ اُدھر کی استریاں تو ہمارے پرشوں کی ماں بنتی ہی رہتی ہیں۔ یہ کوئی نئی

بات نہیں ہے۔ اس کے گربھوتی ہو جانے کا ارتھ یہ نہیں کہ تم اسے اپنی پتنی بنا لو۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔''

''پرنتو ماں! میں اوروں جیسا نہیں ہوں کہ جس کے ساتھ سمبھوگ کیا، اس سے ناتا توڑ لوں۔ میرا سمبھوگ واسنا سے اتیجت سمبھوگ نہیں تھا۔ میرا سمبھوگ پریم سے پریرت تھا۔ میں اوروں کی بھانتی پشو اور امانش نہیں کہ اپنا بچہ اُدھر گلنے سڑنے کے لیے یوں ہی چھوڑ دوں گا۔ میں تو اسے اِدھر لاؤں گا۔ اس کا پالن پوشن اس کے اپنے گھر میں ہوگا۔ یدی آپ نہیں چاہیں گی تب بھی میں بندیا کو اپناؤں گا۔''

ماں بیٹے کا فیصلہ سن کر گھبرا گئی۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر سنجیدگی اختیار کرتی ہوئی بولی۔

''پرنتو تم بندیا سے وِواہ کیسے کر سکتے ہو؟ ایک اڑچن اس میں اور بھی ہے۔''

''کیسی اڑچن ماں؟''

ماں چپ رہی۔

''بولو نا ماں! اور کون سی اڑچن ہے؟''

''بیٹے اس اڑچن کو تم نا ہی سنو تو اچھا ہے۔''

''نہیں ماں! بتاؤ، تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔''

''کیا کرو گے سن کر۔ تم سے سہن نہیں ہوگا۔''

ایسی کیا بات ہو سکتی ہے۔ جس کو وہ سہہ نہیں سکتا۔ بالیشور کچھ دیر تک سنجیدہ ہو کر سوچتا رہا۔ پھر ماں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا:

''ماں! تمہارا یہ بیٹا اتنا دربل نہیں جتنا کہ تم سوچ رہی ہو۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میرا ہردیہ اب بہت کٹھور ہو چکا ہے۔ میں کچھ بھی سن سکتا ہوں۔ سب کچھ سہہ سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ۔ سنکوچ مت کرو۔''

''ٹھیک ہے جب تم نہیں مانتے تو سنو۔ بات یہ ہے...

ماں کی زبان پھر بند ہو گئی۔

''ہاں، ہاں، بولو ماں! کیا بات ہے؟''

"بندیا کا سمبندھ بابا سے رہ چکا ہے۔" ماں نے تیزی سے یہ جملہ ادا کر کے اپنا سر جھکا لیا۔

"کیا بکتی ہو ماں! یہ سچ نہیں ہے۔ ایسا کداپی نہیں ہو سکتا۔"

"یہ شت پرتی شت سچ ہے۔ ہو سکتا ہے بندیا کی اس میں اچھا نہ ہو پرنتو بابا..." ماں نے گردن جھکائے ہوئے جواب دیا۔

"بابا تو ایسے نہیں ہیں ماں! وہ کٹھور ہو سکتے ہیں پرنتو ان کا آچرن ایسا ہوگا، میں اسے ماننے کے لیے تیار نہیں۔"

"بیٹے! تمہیں یاد ہے بندیا ایک دن بابا کے کمرے سے روتی ہوئی نکلی تھی؟"

"ہاں، یاد ہے، اس دن بابا کے کمرے میں اس کا گھاؤ پھوٹ گیا تھا۔"

"بندیا کا کوئی گھاؤ نہیں پھوٹا تھا۔ اس کا رکت گھاؤ سے نہیں...."

"آگے کچھ نہیں ماں! میں سمجھ گیا۔"

بندیا کا زرد چہرہ، خون میں سنی اس کی ساڑی، اس کی آنکھوں سے جاری آنسو، اس کا منہ پر ہاتھ رکھ کر بدحواسی میں بھاگنا۔ ایک ایک منظر ابھر آیا۔

بالیشور پر سکتہ طاری ہو گیا۔ جیسے اچانک اس پر فالج گر پڑا ہو۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔

اس کے ذہن نے بابا کو کھینچ کر اس کی آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کیا۔

بابا کو دیکھتے ہی اسے بچپن کا ایک خواب یاد آنے لگا۔ خواب جس میں بابا کے کمرے سے ایک انوکھے انداز کا سانپ نکلا تھا اور آنگن میں جا کر میمنوں اور کبوتروں کو ڈس کر واپس ان کے کمرے میں آ گیا تھا۔

خواب کا سانپ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ آگے بڑھ کر سانپ کا سر کچل دے۔ اس کی آنکھیں پھوڑ دے۔ اس کے دانت توڑ ڈالے۔

بالیشور کے چہرے کا تناؤ دیکھ کر ماں ڈر گئی۔ بیٹے کے خوف ناک خاموشی اور چہرے کی وحشت ماں کی وحشت کو بڑھانے لگی۔

"کہاں کھو گئے بیٹے۔" ماں نے ڈرتے ڈرتے بالیشور کو مخاطب کیا۔

بالیشور چپ رہا۔

"کچھ بولو نا بیٹے! تمہاری چپّی سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"بابا اتے نردئی ہوں گے میں نے کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا ہوگا... ماں! بندیا کی آنکھوں سے آنسو اس لیے نہیں ٹپکے تھے کہ اسے اپنی لاج کے لٹ جانے کا دکھ تھا۔ اس کے مکھ کا رنگ اس لیے نہیں اڑا تھا کہ اس کے لیے اسے کسی پرکار کی چنتا تھی۔ اس پرکار کا بھاؤ تو ان بے چاروں میں کبھی جنما ہی نہیں... ماں، اس کے وہ آنسو ویتھا کے آنسو تھے۔ اس کے مکھ کا پیلا پن پیڑا سے اتپنّ ہوا تھا۔ یہ وہ ویتھا تھی جو اس کے کچے شریر میں پکی چوٹ سے پیدا کی گئی تھی۔ یہ وہ پیڑا تھی جو اس کے کومل انگ کے کچلے جانے کے کارن پنپی تھی۔ ماں! بابا نے بہت بڑا پاپ کیا ہے۔"

"پاپ! کیسا پاپ؟ بابا نے کوئی پاپ نہیں کیا ہے۔ داسی کے ساتھ سمبندھ رکھنا واستو میں کوئی پاپ نہیں، داسی ہوتی ہی اس لیے ہے کہ سوامی جس پرکار چاہے، اس کا اپیوگ کرے۔ میں نے اسی لیے اس کے ساتھ تمہارے سمبندھ کی سوچنا کو برا نہیں مانا کہ تم بھی داسی کا اپیوگ کیا ہے اور اسی لیے یہ کسی ودھی ودھان کے وِرودھ بھی نہیں ہے۔"

ماں سے یہ باتیں سن کر بالیشور کی نگاہیں ماں کو گھورنے لگیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے ماں میں بابا کی آتما داخل ہو گئی ہے۔ اسے برہما کے شبد یاد آنے لگے۔

"یہ میرے چرنوں سے نکلا ساہسی، شرم جیوی، دھیروان، انتم مانو شرَم تتھا سیوا کرے گا۔ اپنے شَرَم سے تم تینوں کی چھمتا کو بڑھائے گا۔ اپنی سیوا سے تمہیں سکھ پہنچائے گا۔"

کیا یہ شبد سچ مچ برہما کے ہیں؟

کیا برہما نے سرِشٹی کی رچنا واستو میں اسی پرکار کی ہے؟

کیا واستو میں برہما سب کو ایک درشٹی سے نہیں دیکھتا؟

کیا وہ منش منش میں انتر کرتا ہے؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ شبد برہما کے نہ ہوں؟

سرِشٹی کی رچنا ناٹک ماتر ہو؟

کہیں یہ بھی کوئی شڈ یںتر نہ ہو؟

بالیشور دیر تک ماں کے چہرے پر نظریں گڑائے رکھنے اور اپنے اندر سوالوں کی گونج سنتے رہنے کے بعد بولا:

''ماں! آپ کچھ بھی کہیں، آپ کا ودھان کچھ بھی بولے، پرنتو میں اس کو پاپ سمجھتا ہوں۔ بابا نے پاپ کیا ہے۔ اور میں اس کا پرائشچت کروں گا۔ بندیا کو اپنی پتنی بناؤں گا۔''

''بیٹے! تمہاری یہ ہٹ کسی کے بھی ہت میں اچت نہیں اور یدی بابا نے یہ سن لیا تو اس گھر میں بھونچال آجائے گا۔''

''بھونچال آتا ہے تو آجائے اور آپ کو سویکار نہیں تو نہ سہی، میں نے نشچے کر لیا ہے کہ بندیا کو اپنے گھر لاؤں گا۔ اپنے اور اس کے بچے کو اپنے ہاتھوں سے پالوں گا۔ اسے پڑھاؤں گا لکھاؤں گا۔ دویہ بانی سناؤں گا کہ اس پر پورا ادھیکار ہے۔''

''میرے جیتے جی ان میں سے کوئی بھی اِدھر نہیں آسکتا۔ اُدھر کی استری کے پیٹ سے جنما ہوا بچہ کدا پی دویہ بانی سننے کا ادھیکاری نہیں ہو سکتا۔ یدی ایسا ہوا تو اس کا پرینام بھی ہوگا جو بالو اور جھگرو کا ہوا۔''

''جھگرو کے بیٹے اور میرے بچے میں بہت بڑا انتر ہے ماں! مانا کہ شودر پتر پر دویہ بانی کا سننا ورجت ہے۔ اسے یہ ادھیکار نہیں کہ وہ پاٹھ شالا جائے۔ دویہ بانی سنے، پرنتو بندیا کے پیٹ سے جنم لینے والا بچہ کسی شودر کا بیٹا نہیں بلکہ برہمن کا پتر ہوگا اور برہمن پتر کا تو یہ جنم سدھ ادھیکار ہے کہ وہ اِس بانی کا سُر سُنے۔''

'ایسے نہ جانے برہمنوں کے کتنے ہی بچے شودر پیٹ سے جنمے پڑے ہیں تو کیا ان سب کو دویہ بانی سننے کا ادھیکار مل جائے گا؟''

''اوشیہ ملنا چاہیے ماں! جنم لینے والے کی پہچان ماں کے پیٹ سے نہیں بلکہ باپ کے لہو سے بنتی ہے۔ پرنتو یہ کیسی وِڈمبنا ہے ماں کہ برہمن پتر ہو کر بھی سینکڑوں بچے شودر بن کر اپنا پورا جیون بِتا دیتے ہیں اور اپنے اس ادھیکار سے جیون کے انتم چھنڑ تک وَنچت رہتے ہیں جو ان کا جنم سدھ ادھیکار ہے۔ میں! میں تو کہتا ہوں کہ دویہ بانی سننے کا ادھیکار

سب کو ملنا چاہیے۔ جو برہمن پتر ہے اسے بھی اور جو برہمن نہیں ہے اسے بھی۔''

ماں اس بانی میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ اوروں کے لیے نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کسی پر وَرجت نہیں ہے۔ یہ سب کے لیے ہے۔ تمھیں وشواس نہیں ہو رہا ہے تو تم دو یہ بانی کا یہ بول سنو، تمھیں سویم آبھاس ہو جائے گا کہ یہ کسی ایک کے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے ہے:

سنو کہ مجھ میں، سموچے سنسار کے سُکھ کا سار، چھپا ہے

سب کے سوارتھ کا آدھار، گڑا ہے، سب کے ہِت کا کوشا گار، دبا ہے، سب کے آہار کا بھنڈار، بھرا ہے

مجھ میں جو کچھ بھی رکھا ہے، اس میں ایک ایک کا ساجھا ہے، سنو کہ سکھ کا سمبندھ، اندریوں سے ہے، اندریاں، جو اندر سے بھی ادھیک، گنی ایوم گیانی ہوتی ہیں

گیان، دھیان، یوگ، پریوگ، سادھنا، کلپنا، سب کے سب جن کے، ادھین ہوتے ہیں

اندریوں کو اپنے سُر سے، کٹنے نہ دو، انھیں اونگھنے بھی نہ دو، انھیں سدیو جگائے رکھو، ان کی جوت جلائے رکھو، کہ ان کے جاگنے سے ہی، سگندھ پھوٹتی ہے، سگندھ!، جو بھی پرکار کا سکھ، پردان کرتی ہے

ماں اس پرسنگ کا سمبودھن کسی ویکتی یا جاتی وِشیش سے نہیں بلکہ سموچے مانو جاتی سے ہے، اندریاں سب کے پاس ہوتی ہیں۔ اُدھر والوں کے پاس بھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کے اندریوں سے سگندھ نہیں پھوٹتی... جانتی ہو ماں، ان کی اندریوں سے سگندھ کیوں نہیں پھوٹتی؟

''کیوں نہیں پھوٹتی؟'' ماں کے لہجے میں تجسس در آیا۔

''اس لیے کہ جس سُر سے یہ سگندھ پھوٹتی ہے وہ سُر ان کے کانوں تک نہیں پہنچ پاتا۔''

''کون سا سُر؟ میں سمجھی نہیں۔'' ماں حیران ہو کر بالیشور کی طرف دیکھنے لگی۔

''وہی سُر جسے ابھی ابھی تم نے سنا ہے۔''

''تمہارا اسنکیت دو یہ بانی کی اور تو نہیں ہے؟''

''ہاں ماں! اسی کی اور ہے۔ وہی سُر ہے جس میں سموچے سنسار کا سکھ چھپا ہے۔

پرنتو اُدھر والوں کو اس سے دور رکھا جاتا ہے۔ جانتی ہو ماں، ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟''

''کیوں کیا جاتا ہے؟''

''اس لیے کہ اس پانی کے نِکٹ آنے سے ان کی اندریاں بھی جاگ اٹھیں گی۔ اور یدی ان کی اندریاں جاگ پڑیں تو ان کا من بھی مہک اٹھے گا۔ ان کا مکھ منڈل بھی مسکان سے بھر جائے گا۔ ان کی توچا سے بھی کرن پھوٹ پڑے گی۔ ان کے روپ پر بھی رنگ چڑھ جائے گا۔''

ماں! کیا تم نے کبھی دھیان دیا ہے کہ چمٹولی کی مہیلاؤں کی چیتنا، ان کا وِویک ان سے چھین لیا گیا ہے۔ ان کی آنکھوں سے لوک لاج نکال لی گئی ہے۔ ان کی گیان اندریوں کو گیان ہین کر دیا گیا ہے۔ ان کی آتما ان سے الگ کر دی گئی ہے۔...وہ سب کے سامنے ننگی نہاتی ہیں۔ ان کی چھاتیاں لوگوں کے سامنے کھلی رہتی ہیں۔ ان کی ساڑی نہاتے سمے ان کی جانگھوں کی انتم چھور تک اٹھی رہتی ہے۔ انھیں کوئی لاج نہیں آتی۔ انھیں تنک بھی جھجک نہیں ہوتی۔

ان کے پرش بھی ان کو اِس دشا میں دیکھ کر اچنبھت نہیں ہوتے۔ ان کے لیے ان کی استریوں کے گپتانگ مانس کے لوتھڑے سے ادھیک مہتو نہیں رکھتے۔ ناری کے وہ انگ جو رشیوں منیوں کی تپسیا کو بھی بھنگ کر دیتے ہیں۔ سادھو سنتوں کی آستھا کو ڈگمگا دیتے ہیں۔ ان کے دھیان کو وِچلت کر دیتے ہیں، نرجیو اور ویرتھ ہو کر رہ گئے ہیں...ماں! میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ استری جات کا گھور اپمان نہیں کہ اس سے اس کی چیتنا چھین لی جائے۔ اس کا استر تو نشٹ کر دیا جائے...ماں، تم استری ہو، تم اس تتھیہ کو مجھ سے ادھیک گہرائی سے انوبھو کر سکتی ہو...ماں، کیا تم یہ سہہ سکو گی کہ کوئی پرش تمہاری اور کبھی نہ دیکھے۔ یدی دیکھے تو ترنت تمہارے اوپر سے اپنی درشٹی ہٹا لے۔ تمہارا شریر اس پر کچھ بھی پربھاؤ نہ ڈال سکے۔ ارتھات کیا تم اپنے شریر، اپنے رنگ، اپنے روپ، اپنے یوون کا اپمان چپ چاپ سہہ سکو گی؟ میں جانتا ہوں کہ تم اس اپمان کو سہن نہیں کر سکتی۔ پرنتو سینکڑوں لاکھوں استریاں یہ اپمان سہن کر رہی ہیں۔ اس پیڑا کو سہہ رہی ہیں۔ سب کو نہیں تو کم سے کم ایک استری کو تو میں اپمانت ہونے سے بچا لوں۔

ماں جواب تک خاموشی سے بیٹے کی باتوں کو سن رہی تھی۔ اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی:

''بیٹے، یہ سب تو ٹھیک ہے، پر میں پورجوں کے ودھی اور پرمپراؤں سے بندھی

ہوئی ہوں اس کے ورودھ نہیں جا سکتی۔

''آپ کیسی ناری ہیں ماں! اسی ودھی ودھان اور پرمپرا کے پھیر میں آپ نے اپنے پتی کو کھو دیا اور اب اپنا بیٹا کھونے پر تلی ہوئی ہیں۔''

ماں کو محسوس ہوا جیسے اُس کے دماغ پر کسی نے ہتھوڑا برسا دیا ہو، وہ تلملا اٹھی۔ بیٹے نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔

اچانک پرمپرا کا نشہ نیچے اتر آیا۔ آنکھوں میں ایک سراپا آ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ وہ سراپا تھا جس کو اس نے پانے سے پہلے بھی چاہا تھا اور پانے کے بعد بھی۔ جسے حاصل کرنے میں اس کی مرضی کا بھی دخل تھا۔ جسے اس نے دل و جان سے پیار کیا تھا۔ ٹوٹ کر چاہا تھا۔

یہ وہ سراپا تھا جو اس کے قریب آتا تھا تو وہ ساری دنیا کو بھول جاتی تھی اور جب اسے اپنی باہوں میں بھرتا تھا تو وہ اپنے آپ کو بھی یاد نہیں رکھ پاتی تھی۔

پیار کو کھونے کی وجہ پرمپرا تھی جس کی جڑیں پیار سے بھی زیادہ مضبوط تھیں اور جو اس کے اندر گہرائی تک اتری ہوئی تھیں۔ اس کے کل کے رسم و رواج اور گھر آنگن کے سنسکار اس کے اندر نسوں کے جال کی طرح پھیلے ہوئے تھے جنھوں نے اس کے تن من کو چاروں طرف سے جکڑ رکھا تھا۔ سنسکار کا یہ جال اتنا توانا تھا کہ اس کا اٹوٹ پیار بھی اسے نہ توڑ پایا تھا۔ اس کا ہم سفر ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو رہا تھا۔ اس کا پیار اس سے چھن رہا تھا مگر وہ پرمپرا کی کنڈلی میں جکڑی کسی بت کی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اس کے شوہر نے اس سے کہا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی نہ ہو سکی تھی۔

شوہر کے جانے کا اسے دکھ بہت ہوا مگر افسوس بالکل نہیں کہ مریادا کی حفاظت کے احساس اور بابا کی شاباشی نے اس وقت اس کی رگوں میں ایک نشہ سا بھر دیا تھا۔

جب کبھی نشہ کسی وجہ سے ہلکا پڑتا تو اس کی آنکھیں چھلک پڑتیں اور دیدوں میں شوہر کا عکس ابھر آتا، آج بیٹے کی باتوں نے اس نشے کو نیچے اتار دیا تھا اور شوہر کا سراپا آنکھوں میں ابھر آیا تھا۔

یہ وہ سراپا تھا جو قریب آتا تھا تو ساری دنیا کو بھول جاتی تھی اور جب اسے اپنی

باہوں میں بھرتا تھا تو وہ اپنے آپ کو بھی یاد نہیں رکھ پاتی تھی۔

اس اسے سر اپنے کی باہوں کا گھیراؤ یاد آنے لگا۔ اس کی گرفت یاد آنے لگی۔ اس کی یاد ستانے لگی۔ دل بے چین ہوا تھا۔ ذہن میں طرح طرح کے سوال اٹھنے لگے۔

پتا نہیں وہ کہاں ہوں گے؟ کس حالت میں ہوں گے؟ اتنے دن کس طرح بتائے ہوں گے؟ کون ان کی دیکھ بھال کرتا ہوگا؟ کون انھیں کھلاتا پلاتا ہوگا؟ کیا کرتے ہوں گے؟ کیسے رہتے ہوں گے؟

انھیں اکیلا پن کاٹتا ہوگا۔ سونا پن ان کے تن من کو ڈستا ہوگا۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟ میرا پیار انھیں کھولا لگتا ہوگا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ اس سے چلی جاتی تو انھیں یوں اکیلا تو نہیں رہنا پڑتا۔ ان کا سونا پن تو بٹ جاتا۔ اس کی اپنی جوانی بھی یوں بے کار نہ جاتی۔

اچانک اس کا اپنا سراپا اس کی آنکھوں میں ابھر آیا۔

سادہ لباس، سادہ رنگ وروپ، اداس آنکھیں، روکھا پھیکا چہرہ، فکر سے بھری پیشانی، بالوں میں سفیدی، باہر اُداسی اندر سناٹا، دور دور تک...

اس کی اداسی اور گہری ہوگئی۔ چہرے کا رنگ اور پھیکا پڑ گیا۔ انھوں نے بھی تو اس کی کوئی کھوج خبر نہیں لی۔ اس سے انھوں نے بھی تو ہٹ نہیں کی تھی جیسا کہ بالشیور کر رہا تھا۔ کاش انھوں نے بھی اپنا منہ کھولا ہوتا! واد وِواد کیا ہوا۔ اُسے اِس پرکار سمجھایا ہوتا جس پرکار آج ان کا بالک سمجھا رہا تھا...

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''ماں! مجھے وشواس ہے کہ میری باتیں تمہیں ٹھیک لگ رہی ہوں گی اور تم اوشیہ ہی ان پر ٹھنڈے من سے وِچار کرو گی۔''

''بیٹے! تمہاری باتیں سچ مچ میرے من کو چھو رہی ہیں۔ پرنتو میں بابا کے ہردیہ کو نہیں بدل سکتی۔ وہ کداپی اس کے تیار نہیں ہوں گے جو تم چاہ رہے ہو اور میں بھی ان کے وروودھ جانے کا ساہس نہیں کر سکتی... میں تمہارا ہردیہ بھی دکھانا نہیں چاہتی۔ بیٹے! میں تمہیں

کھونا نہیں چاہتی۔ میری تو سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا ہے؟''

''ماں! مجھے کیول تمہارا آشیرواد چاہیے۔ میں اپنی لڑائی سویم لڑوں گا۔''

''میرا آشیرواد تو سدیو تمہارے ساتھ رہے گا پرنتو بیٹے! تم جس لڑائی کی بات کر رہے ہو، یہ کوئی سرل لڑائی نہیں ہے۔ یہ لڑائی کسی ایک ویکتی سے تو ہے نہیں کہ اس سے لڑکر سمسیا کا سمادھان نکال لوگے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم ہار جاؤ گے۔ بھگوان کرے تم جیت جاؤ۔ پرنتو اکیلا کسی ودھان ایوم پرمپرا سے نہیں لڑا جا سکتا۔''

''ماں! میں مانتا ہوں کہ ہمارا ودھان بڑا بلوان ہے۔ اس سے ٹکرانا سرل نہیں ہے۔ اس کو توڑنا کٹھن ہے۔ پر اس کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا تو اور بھی شکتی شالی ہو جائے گا۔ اس لیے کسی نہ کسی کو تو آگے آنا ہی چاہیے۔ اس سے ٹکرانا ہی چاہیے۔ ماں! یہ لڑائی میں کیول اپنے سوارتھ کے لیے نہیں لڑنا چاہتا بلکہ یہ لڑائی میں اس لیے بھی لڑنا چاہتا ہوں کہ وہ سُر جس سے سگندھ پھوٹتی ہے اس کان میں بھی پرویش کرے جس کے سامنے پرمپرا کی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں۔''

''پرنتو تمہاری یہ اچھا کبھی پوری نہیں ہوگی بیٹے۔ ہو سکتا ہے اس یدھ میں تمہارا...''

ماں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''جو بھی ہو ماں! پر میں یہ یدھ لڑوں گا۔ میں ہر ایک پرستھیتی کا سامنا کروں گا اور پرتیکشا کروں گا اس دن کی، اس سمے کی، اس اوسر کی جو مجھے ایک نہ ایک دن ملے گا کہ ہماری اس پرمپرا کی میرے لیے ایک اچھی بات یہ ہوگی کہ اس کی پروہتی پرتھا ونشانوگت ہے۔''

''ٹھیک ہے، جیسا تم اچیت سمجھو، کرو۔ میرا آشیرواد تمہارے ساتھ ہے۔ ودھی کی ڈور سے بندھی یہ ناری بھلے ہی تمہارا ساتھ نہ دے پرنتو ایک ماں کا ہردیہ سدیو تیری وجے کی کامنا کرتا رہے گا۔''

''دھنیہ واد! بہت بہت دھنیہ واد ماں! میں تم سے بس اتنا ہی چاہتا ہوں۔ تمہارا یہ آشیرواد ہی میرے لیے بہت ہے۔''

بالیشور کی آنکھیں ماں کے چہرے میں کھو گئیں۔ جس کے اوپر سے پرمپرا کی کرختگی کی تہہ اتر چکی تھی اور جس پر ممتا کے صندل کا لیپ چڑھ گیا تھا۔

(''ودیہ بانی'' سے ماخوذ)

اُردو اکادمی دہلی

(دہلی سرکار)

اکادمی کی ۲۰۰۴-۲۰۰۳ء کی تعلیمی سرگرمیاں ایک نظر میں

درس و تدریس: درس و تدریس کے میدان میں مختلف درسگاہوں کو اردو کی تعلیم جاری رکھنے کے پیش نظر اردو اساتذہ کی فراہمی کو فوقیت دی ہے۔ ان اساتذہ کی تنخواہوں کی ادائیگی اکادمی اپنے بجٹ سے کرتی ہے۔ سال گزشتہ 134 اساتذہ نے اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے ہوئے تقریباً اسکولوں میں 16107 طلباء کو تعلیم دی۔

طلباء کے لیے وظائف: پرائمری اسکول سے کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک اردو میڈیم سے تعلیم پانے والے یا بطور مضمون اردو پڑھنے والے ہونہار طلباٗ و طالبات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ایسے طلباء و طالبات کو جو بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں اول، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کرتے ہیں، انھیں اکادمی ماہانہ وظیفہ، نقد انعام اور اکادمی کا یادگار نشان پیش کرتی ہے۔ اسی طرح اسکولوں میں اردو میں اپنی کلاسوں میں اول آنے والے ہونہار طلباٗ و طالبات کو بھی اکادمی یکمشت وظائف دیتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت گزشتہ سال 608 طالب علموں کو وظائف و انعامات کے طور پر تقریباً سات لاکھ روپے تقسیم کیے گئے۔

اُردو اکادمی اسکولوں کی لائبریریوں کے لیے ایسے اُردو رسائل و جرائد اور مفید و معیاری کتابیں بڑی تعداد میں مہیا کرتی ہے جو اساتذہ اور طلباٗ کو جدید معلومات فراہم کرسکیں۔ گزشتہ سال اس اسکیم کے تحت ماہانہ پچیس رسائل و جرائد اور تقریباً پانچ سو کتابیں 38 اردو اسکولوں میں مفت فراہم کی گئیں۔

کوچنگ کلاسیز کا اهتمام: اردو اکادمی، دہلی اُن کوچنگ سینٹرز میں انسٹرکٹرز بھیجتی ہے جہاں طلباء کو دسویں اور بارہویں کے امتحانات کے لیے کوچنگ دی جاتی ہے۔ نیز اُن کوچنگ سینٹرز کی بھی مدد کرتی ہے جن میں طالبات کو پڑھائی کے ساتھ ساتھ سلائی کڑھائی وغیرہ کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

اکادمی اُن طلباء کے لیے کوچنگ کا انتظام بھی کرتی ہے، جو دہلی کے مختلف ٹیچرس ٹریننگ کالجوں میں ای۔ ٹی۔ ای اور بی۔ ایڈ میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔ انھیں اردو میڈیم سے تمام مضامین کی کوچنگ کرائی جاتی ہے۔ گزشتہ سال ای۔ ٹی۔ ای اور بی۔ ایڈ میں داخلہ کے تقریباً 100 امیدواروں کی کوچنگ کی گئی جس میں سے تقریباً 15 امیدوار کامیاب ہوئے۔

تعلیمی مقابلے اور امنگ پینٹنگ مقابلہ: اکادمی ہر سال پرائمری سے سینئر سیکنڈری سطح تک تعلیمی مقابلہ منعقد کراتی ہے ان مقابلوں میں وہ اسکول حصہ لے سکتے ہیں جہاں ذریعہ تعلیم اُردو ہے یا اُردو بحیثیت مضمون پڑھائی جارہی ہے۔ ان اسکولی بچوں کے لیے جو اپنا نام اور تصویر کا عنوان وغیرہ اُردو رسم الخط میں لکھ سکیں پینٹنگ مقابلہ بھی ہوتا ہے ان مقابلوں میں اول، دوم، سوم آنے والوں کو نقد انعامات و شیلڈیں بھی دی جاتی ہیں۔ گزشتہ سال 12 دن تک یہ مقابلے چلے جس میں اردو زبان و ادب اور ثقافت کے پچاس ماہرین نے ان مقابلوں میں ججز کے فرائض انجام دیتے ہوئے اکادمی کے اس پروگرام کو قابل تحسین بتایا۔ ان مقابلوں میں نمایاں کارکردگی دکھانے والے تقریباً 250 طلباء و طالبات کو نقد انعامات، شیلڈ اور سرٹیفکیٹ دیے گئے۔ اس پر تقریباً تین لاکھ روپے تقسیم کیے گئے۔

اُردو سرٹیفکیٹ کورس اور اُردو ڈپلومہ کورس: اُردو اکادمی نے غیر اُردو داں حضرات کو اُردو سکھانے کے لیے دہلی اور نئی دہلی میں بارہ مراکز قائم کر رکھے ہیں جہاں ہر عمر کی خواتین اور حضرات کو شام کے وقت دہلی یونیورسٹی سے منظور شدہ اُردو سرٹیفکیٹ کورس کے تحت ابتدا سے اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ ان طلباٗ کے لیے مفت کتابوں کے ساتھ ساتھ پچاس روپے ماہانہ بطور سفر خرچ بھی دیا جاتا ہے۔ ایک سالہ اُردو ڈپلومہ کورس کا بھی انتظام ہے جہاں سرٹیفکیٹ کورس پاس کرنے والے لوگوں کو اُردو کی مزید تعلیم دی جاتی ہے۔ گزشتہ سال ان مراکز پر 560 افراد نے داخلہ لیا۔

اردو خواندگی اسکیم: اُردو اکادمی قومی تعلیمی مشن کے تحت ناخواندگی دور کرنے کی غرض سے ایک اسکیم پر عمل کررہی ہے جس کا نام "اردو خواندگی اسکیم" ہے۔ اکادمی کی جانب سے دہلی کے مختلف علاقوں میں تعلیم بالغان کے یہ مراکز قائم کیے گئے ہیں۔ ان مراکز پر کتابیں اور اسٹیشنری وغیرہ اکادمی خود ہی فراہم کرتی ہے۔ دو برس سے اس طرف خاص توجہ دی گئی ہے اور کئی نئے علاقوں میں مراکز قائم کیے گئے ہیں تاکہ اردو رسم الخط کو عام کیا جائے کیونکہ رسم الخط ہی زبان کی روح ہے اور اس سے آشنائی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ گزشتہ سال 160 مراکز پر 3700 افراد کو خواندہ بنایا گیا اور سالانہ جلسہ تقسیم انعامات میں نمایاں کارکردگی دکھانے والے 100 طلباء اور 40 انسٹرکٹرز کو نقد انعامات، شیلڈ اور سرٹیفکیٹ دیے گئے۔ اس اسکیم کی افادیت کو دیکھتے ہوئے اکادمی کے وائس چیئرمین نے ان مراکز کی تعداد میں خاطر خواہ اضافے کا اعلان کیا ہے۔

فنی تعلیم: کتابت کے فن کو قائم و دائم رکھنے کے لیے اکادمی نے کتابت مرکز بھی قائم رکھا ہے۔ اس مرکز میں طلباٗ و طالبات کو دو سال کی مدت کے لیے -/120 روپے ماہانہ وظیفہ کے ساتھ کتابت سکھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اُردو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے والوں کے لیے ایک تربیتی مرکز بھی قائم کیا ہوا ہے ان طلباٗ کو بھی 100 روپے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا ہے۔ ایک سال ٹائپ شارٹ ہینڈ سکھانے کے بعد ان طلبا کو کمپیوٹر کی ابتدائی معلومات بھی فراہم کی جاتی ہے۔ گزشتہ سال اس مرکز پر 18 طلباء کو تعلیم دی گئی۔

م۔ افضل
وائس چیئرمین

مرغوب حیدر عابدی
سکریٹری

۵۔ شام ناتھ مارگ، دہلی ۱۱۰۰۵۴ فون نمبر: 23830636, 23830637

ڈاکٹر بشیشر پردیپ

خدمت گار

تقریباً پانچ سومیٹر کی پہاڑی چڑھائی چڑھنے کے بعد جب ہم لوگ اس ڈاک بنگلے تک پہنچے تو شام رات میں بدل چکی تھی اور اس پہاڑی ڈھلوان پر ایک دوسرے سے تقریباً تھوڑے فاصلے پر بنے جو پندرہ بیس گھر تھے ان میں سے روشنی چھن چھن کر آنے لگی تھی۔ پہاڑی قلی نے پیٹھ پر سے ہمارا سامان اتارا اور ڈاک بنگلے کے گیٹ کے پاس رکھ دیا اور خود چوکیدار کو بلانے چلا گیا۔

میں اور میرا ساتھی جیالوجسٹ مصرا پچھلے دو دن سے نیچے اتر کاشی میں دریا کے کنارے بنے بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور اب تین چار دن کے لیے اس پہاڑی پر ایک سرکاری عمارت کی تعمیر کے لیے مناسب جگہ کی تلاش میں آئے تھے۔ مجھے اس جگہ کی بنیادی مٹی کا بوجھ برداشت کرنے کی طاقت کا پتہ لگانا تھا اور جیالوجسٹ مصرا کو اس علاقے کی ٹاپوگرافی کا مطالعہ کرنا تھا۔

اس اونچائی پر سے نیچے اتر کاشی کی روشنیاں ایک دلفریب نظارا پیش کر رہی تھیں۔ اوپر آسمان پر دمکتے چمکتے ستارے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم ستاروں کے اور نزدیک پہنچ گئے ہوں۔ ہوا بھی کچھ اور صاف ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈاک بنگلے کے دائیں طرف چار دیواری سے سٹے ہوئے ایک گھر میں سے اچانک روشنی نظر آنے لگی۔ وہ چوکیدار کا گھر تھا۔ اور اس نے قلی کے پہنچنے پر روشنی کی تھی۔ اب وہ ہاتھ میں لالٹین پکڑے قلی کے ساتھ ہماری طرف آرہا تھا۔

''چوکیدار! تمہیں ہمارے یہاں آنے کی خبر تو مل گئی ہوگی؟

''جی شاب جی۔ آج صبح جونیئر انجینئر شاب آئے تھے۔''

اور اس نے گیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اور پھر کمرے کا۔ اور اندر داخل ہوتے ہی میز پر رکھا مٹی کے تیل کا ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ اور اس کی بتی ذرا اونچی کر دی۔ آزادی سے پہلے کا

اس ٹیلے پر بنا یہ ڈاک بنگلہ صرف ایک کمرے کے سیٹ پر مشتمل تھا۔ اتنا پرانا ہونے کے باوجود بہت اچھی حالت میں تھا۔ اور چوکیدار نے اسے صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ چوکیدار سے پتہ چلا کہ سال میں ایک دو بار ہی کوئی آ کر ٹھہرتا تھا یہاں۔ اور وہ بھی زیادہ تر دن بھر کے لیے۔ ڈاک بنگلے کے چوکیدار کا ایک اہم کام وہاں ٹھہرنے والوں کے لیے کھانا بنانا ہوا کرتا ہے۔ اور اس کے لیے برتن، کراکری سب سامان ڈاک بنگلے میں رکھا رہتا ہے۔ میں نے چوکیدار کو سو سو روپے کے دو نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

''کل صبح اتر کاشی سے ضروری سامان خرید لانا۔ کھانا بنانے کے لیے۔ ایک دال بنے گی اور ایک سبزی اور تھوڑے سے چاول بھی بنا لینا۔ ٹھیک ہے؟''

''جی شاب جی۔''

چوکیدار نوٹ ہاتھ میں پکڑے جانے لگا تو میں نے کہا۔

''سنو۔ صبح بیڈ ٹی مل سکے گی؟ میرا مطلب ہے چائے؟''

''جی شاب جی۔''

''تو ذرا کڑک'' چائے بنانا۔ دودھ صرف ایک چمچہ۔'' مصرا نے کہا۔

''جی شاب جی۔'' اور چوکیدار چلا گیا۔

رات کافی گہری نیند آئی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو سات بج رہے تھے۔ مصرا ابھی کمبل اوڑھے لیٹا تھا۔ میں گیٹ سے باہر آ کر ڈاک بنگلے کے آس پاس پہاڑی پگ ڈنڈیوں پر ٹہلنے لگا۔ دو چار جگہ ڈھلوان پر سیڑھیوں کی طرح اوپر نیچے بنے چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں پہاڑی عورتیں کام کر رہی تھیں۔ رنگین کھردرے اونی کپڑے پہنے۔ آدھے گھنٹے بعد واپس آیا تو دیکھا کہ چوکیدار گھر سے باہر اپنے چار پانچ ماہ کے بچے کو اٹھائے کھڑا تھا۔ گورے رنگ کا گول مٹول تندرست بچہ میری طرف لپکتا ہوا۔ بچے نے شاید ابھی ابھی دودھ پیا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر دودھ لگا تھا۔ چوکیدار مجھے سلام کرنے کے بعد بولا۔

''چائے بنا لاؤں شاب جی؟''

''ہاں۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد۔''

میں ڈاک بنگلے میں داخل ہوا تو مصرا ابھی اپنے بیڈ پر کمبل میں گھسا جیالوجی کا کوئی جرنل دیکھ رہا تھا۔

''کہاں کہاں گھوم آئے نگم صاحب؟ صبح گھومنے کی تمہاری یہ عادت بہت اچھی ہے یار۔ دورے پر آتے ہو تو بھی صبح گھومنے ضرور جاتے ہو۔ اپنے سے تو یہ ہوتا نہیں۔ اور پھر ہمارا تو اپنے کام کے سلسلے میں بہت گھومنا ہو جاتا ہے۔ سروے کے لیے آس پاس کا سب علاقہ پیدل چل کر ہی تو دیکھنا ہے مجھے۔''

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ تمہارا کام پیدل چلنے کا بہت ہے۔''

''وہ بیڈ ٹی کا کیا ہوا؟ جو تم نے چوکیدار کو صبح بنا لانے کے لیے کہا تھا؟''

''ابھی لا رہا ہے۔''

مصرا کے ساتھ میں نے کئی پہاڑی علاقوں کا دورہ کیا ہے۔ وہ چائے کو ''سنجیونی بوٹی'' کہا کرتا ہے۔ یعنی مردے میں جان ڈالنے والی بوٹی۔ صبح جب تک بیڈ ٹی نہیں پی لے گا۔ بستر نہیں چھوڑے گا۔ میں خود چائے کا ایسا عادی نہیں ہوں۔ لیکن دورے پر مصرا کا ساتھ ضرور دیتا ہوں۔ بلکہ اس کا خیال رکھتے ہوئے چائے کا انتظام بھی میں ہی کرتا ہوں۔ بیڈ ٹی کے انتظار میں میں بھی اپنی بیڈ پر کمبل اوڑھے نیم دراز ہو گیا۔

چند منٹ کے بعد چوکیدار چائے لے آیا۔ ایک چھوٹی سی ٹرے میں دو کپ باقاعدہ پلیٹوں میں رکھے ساتھ میں چینی اور چمچے۔ ہم دونوں کے بیڈ کے بیچ میں میز پر ٹرے رکھ کر چلا گیا تو ہم اپنے اپنے بیڈ پر ٹیک لگائے چائے پینے لگے۔ مصرا کو کڑک چائے اچھی لگتی ہے۔ ایسی چائے جس میں دودھ برائے نام ہو۔ دورے پر میں بھی ایسی چائے پی لیتا ہوں۔ چوکیدار مصرا کی پسند کی چائے بنا لایا تھا۔ چائے گرم تھی لیکن چائے کا مزا کچھ عجیب سا تھا۔ نہ بہت خوشگوار اور نہ ہی ناگوار! کل ملا کر چائے اچھی لگی۔ اور جب چوکیدار کپ اٹھانے کے لیے آیا تو مصرا نے کہہ ہی دیا۔

''چوکیدار چائے اچھی بنی تھی۔''

''جی شاب جی۔'' اس نے سر ہلا کر شکریے کا اظہار کیا۔

پروگرام کے مطابق جونیئر انجینئر نے تجویز کردہ دو جگہوں پر پانچ پانچ گڈھے کھدوا رکھے تھے جن میں سے مجھے نمونے اکٹھے کرنے تھے۔ دس بجے کے قریب جونیئر انجینئر دو مزدوروں کے ساتھ آ گیا۔ اور ہم لوگ سائٹ (Site) کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں گڈھوں کو کچھ اور کھدوا کر نمونے اکٹھے کرواتا رہا اور جیالوسٹ مصرا اپنے جیالوجیکل سروے کے سلسلے میں آس پاس کی چٹانوں کو جانچ کرتا رہا۔ دو بجے تک کام کر کے ہم لوگ ڈاک بنگلے میں واپس آ گئے۔ چوکیدار نے لنچ بہت اچھا تیار کیا تھا۔ لنچ اور پھر آرام کرنے کے بعد ہم لوگ برآمدے میں آ کر بیٹھے ہی تھے کہ چوکیدار چائے لے کر آ گیا۔ پہلا گھونٹ بھرتے ہی میں نے چوکیدار کی طرف دیکھ کر چائے کو سراہنے کے انداز میں ہلکا سا سر ہلا دیا۔ چائے صبح کی جیسی تھی۔ بلکہ صبح والی چائے سے کچھ زیادہ اچھی لگی۔ ہو سکتا ہے کہ صبح ایک ہی بار پینے سے ہم اس کے انوکھے مزے سے مانوس ہو گئے تھے!

''کہو چوکیدار۔ تم اس محکمے میں کب سے ہو؟''

''بارہ شال ہو گئے شاب جی۔''

''بارہ سال؟ تو اب تمہاری نوکری پکی ہو گئی ہو گی؟''

نہ شاب جی۔ ہماری نوکری ابھی تک کچی ہے۔ ابھی تک ہم ''ورک چارج'' میں ہیں۔''

''ارے اتنے برس ہو گئے اور ابھی تم ورک چارج میں ہو؟''

جی شاب جی۔ پوشٹ تو دو خالی پڑی ہیں۔ دو شال سے خالی پڑی ہیں۔ پر بڑے شاب انھیں بھرتے نہیں۔''

''او ہو!'' میں خاموش چائے پینے لگا۔ ایگزیکٹیو انجینئر سے میری تھوڑی بہت جان پہچان ہے۔ آدمی بھلا ہے۔ پھر اس چوکیدار بے چارے کے ساتھ کیوں زیادتی کر رہا ہے؟ کسی سفارش والے کو رکھنا چاہتا ہو گا! اب تو معمولی چپراسی کی نوکری کے لیے منتری لوگ سفارش کرنے لگتے ہیں۔ یہ سیدھا سادا پہاڑی آدمی یہ بات کہاں سمجھے گا۔

چوکیدار کے جانے کے بعد میں نے مصرا سے کہا۔

''یار۔ تم تو اس ایگزیکٹیو انجینئر کو اچھی طرح جانتے ہو۔ ہے نا؟''

''ہاں نگم صاحب! اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ کام کے سلسلے میں کئی بار میرا اور اس کا ساتھ رہا ہے۔''

تو تم اس سے بات کرنا۔ اس بیچارے کی ملازمت پکی ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے۔ کرلیں گے بات۔''

ہم لوگ چار دن وہاں رہے۔ صبح دس ساڑھے دس بجے نکلتے اور دو ڈھائی بجے تک ڈاک بنگلے میں واپس آجاتے۔ میں ان چار دنوں میں باقاعدہ صبح ایک گھنٹے کے لیے گھومنے جاتا رہا۔ اس چھوٹے سے پہاڑی گاؤں کی سب پگڈنڈیاں گھوم چکا تھا۔ بلکہ ان سب گھروں کے آس پاس سے گزر چکا تھا۔ زیادہ تر ان میں رہنے والی عورتیں ہی صبح ملتیں۔ کبھی اپنے چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں کام کرتی ہوئی۔ کبھی پیٹھ پر رکھے تکونے ٹوکروں میں طرح طرح کی جنگلی پھولوں کے گچھے یا صرف پتے ڈالے۔ نیچے اتر کاشی کی طرف جاتی ہوئی۔ کبھی ایک دو مرد بھی مل جاتے۔ اپنی کمر کے گرد رسی لپیٹے۔ یہ مرد اتر کاشی میں قلی گیری کا کام کرتے تھے۔ اور وہ رسی ان کے پیٹھ پر سامان لادنے کے کام آتی تھی۔ چوکیدار دونوں وقت کا کھانا خوب دل لگا کر تیار کرتا۔ ڈائننگ ٹیبل پر صاف ستھری کراکری سجا دیتا۔ پلیٹیں، ڈونگے، چمچے، گلاس، پانی کا مگ اور پھر سبزی، دال، چاول، چپاتیاں، سب گرم۔ کھانا کھانے کا مزہ آتا تھا۔ صبح کی بیڈ ٹی اور شام کی چائے تو بڑی باقاعدہ سے بنا دیتا۔ اس کی چائے کا تو ہم لوگ اب انتظار کرنے لگے تھے!

چوکیدار کی خدمت گزاری سے متاثر ہو کر ہم دونوں نے ہی سوچ رکھا تھا کہ ایگزیکٹیو انجینئر سے اس کی پکی نوکری کے بارے میں ضرور بات کریں گے۔ بارہ برس تک اسے اس طرح عارضی طور پر رکھنا کہاں تک جائز تھا؟ جب کہ دو ملازمتیں خالی پڑی تھیں۔ ڈاک بنگلہ چھوڑنے سے پہلے لاگ بک بھرنے اور ڈاک بنگلے کے حساب میں چوکیدار کو پیسے دینے کے بعد میں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ اسے انعام میں دے دیا جو اس نے خوشی خوشی لے لیا۔

''شاب جی یہ آپ کے پیشے بچ گئے تھے۔''

''اس نے بائیس روپے میری طرف بڑھا دیے۔
''اسے بھی رکھ لو۔ اور جاؤ قلی کو بلا لاؤ۔''
اور تھوڑی دیر کے بعد ایک قلی میرا سامان لے کر نیچے اتر کاشی کی طرف جا رہا تھا۔
خیال تو آیا کہ چوکیدار سے کہہ دوں۔ ''ہم تمہاری ملازمت پکی کروانے کے لیے تمہارے بڑے صاحب سے بات کریں گے۔'' لیکن پھر یہ سوچ کر کہ پتہ نہیں عین وقت پر مصرا کترا جائے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں کے پاؤں چھونے کے بعد جب اس نے ہاتھ جوڑ کر ''نمشتے شاب جی؟'' کہا تو اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔ جیسے وہ اپنے اس کچی ملازمت میں خوش ہو۔ اور ہم سے کسی بھی قسم کی سفارش کی کوئی امید نہ رکھتا ہو اور نہ ہی ضرورت سمجھتا ہو! چلنے سے پہلے میں نے اس کی پھر تعریف کر دی۔
''تم نے کھانا بہت بڑھیا بنا کر کھلایا اور خاص طور پر چائے۔''
اور پھر مجھے اچانک یاد آ گیا مغربی جیالوجسٹ ایمر ہسٹ کی ڈائری کا ایک واقعہ جو اسے ایک جیالوجیکل سروے کے دوران کسی پہاڑی گاؤں میں وہاں کے کسی باشندے کے گھر میں مہمان رہتے وقت پیش آیا تھا اور جو میں نے گذشتہ شب پڑھا تھا اور میں نے چوکیدار سے پوچھ لیا۔
''سنو چوکیدار! یہاں کسی کے پاس گائے تو کیا بکری بھی نہیں ہے۔ تم چائے کے لیے دودھ کہاں سے لاتے تھے؟''
چوکیدار نے نہایت سادہ لوحی سے جواب دیا۔
دودھ شاب جی...؟ شاب جی۔ آپ کے چائے کے لیے بہت تھوڑا سا دودھ چاہیے تھا۔ پر تازہ دودھ چاہیے تھا شاب جی... دو چمچہ صبح۔ دو چمچہ شام تازہ دودھ ہم گھر سے ہی جٹا لیتے تھے۔''
''گھر سے...؟ کیا مطلب؟''
''ہماری گھر والی کا اپنا دودھ شاب جی۔ ہمارا بچہ ابھی پانچ ماہ کا ہی تو ہے۔''
اس نے بلا کسی جھجک کے جواب دیا۔

''ارے!'' میری نگاہوں کے سامنے چوکیدار کا بچہ آ گیا۔ ہمکتا ہوا۔ ہماری طرف لپکتا ہوا۔ دودھ لگے ہونٹوں کے ساتھ۔ اور پھر مجھے نظر آیا کپ۔ کپ میں چائے اور چائے میں تیرتی ہوئی دودھ کا ہلکا سا دائرہ بناتی ہوئی لکیر!

چوکیدار سلام کر کے وہیں کھڑا تھا اور ہم قلی کے پیچھے ڈھلوان پر سے نیچے اتر رہے تھے۔

جب ہم نیچے اتر رہے تھے تو ہم دونوں ہی کو متلی ہو رہی تھی!

''اب زیادہ سوچ نہ یار۔ جو کچھ کھایا پیا وہ تو کب کا ہضم ہو چکا۔''

''میں نے بیکار میں اس سے پوچھ لیا۔ نہ پوچھتا تو اچھا تھا نا؟''

مجھے پھر متلی ہونے لگی۔ میں نے دیکھا۔ مصرا دو قدم پیچھے رہ گیا تھا۔ اور ابکائیاں لے رہا تھا!

(ماخوذ)

بلراج ورما

نِشانمنترن

مارکنڈے پُران کے بھگتی یوگ یعنی عشق حقیقی کی ایک مقدس وموثر کہانی ہے۔ ستیہ وان ساوتری کی گاتھا۔

محبت کے دیوتاؤں سے ہماری قلبی وابستگی اور نرناری میں پیار وایثار کے والہانہ پن کی لہری ہی عاشقی کا وہ تصور اور اظہار ہے جو بھگتی کا سرچشمہ ہے اور ہم پر محبت کے معنی ومفہوم آشکار کرتا ہے۔

یہی مسرّت اور بصیرت کی حقیقت کا وہ مقدس ومقدم مظہر ہے، جس کی ایک جھلک ہی سے عرش کے دیوتا اور مقدروں کے خدا، عاشقوں کو اپنی عقیدت کے پھولوں سے نوازتے ہیں، مسرور ہوتے ہیں اور مسرتیں بکھیرتے ہیں۔

ساوتری وہ مقدس نام ہے جسے ہم ماں جگدھمبا، سیتامیّا کے برابر تولتے ہوئے بھی نہیں جھجکتے۔ ہندوسنسکاروں میں پتی ورتا دھرم وہ مقدم خصلت ہے جس سے ناری دھرم کے ایمان کی اُس جرأت وبساط کے دیدار ہوتے ہیں جسے ہم ایشور پوجا کا درجہ دیتے ہیں۔

ساوتری ایک ایسی مہان آتما تھی جو اپنے پتی ورتا دھرم کے بل پر اپنے پتی ستیہ وان کو موت کے مہاں کال کے چنگل سے بھی چھڑا لائی تھی۔

ساوتری کی وفاشعاری پاکیزگی اور خدمت وایثار کے آج تک گن گائے جاتے ہیں اور مدرراج اشوپتی مہاراج کی اِس کماری کو جنک دُلاری کے برابر رکھتے ہیں جبکہ سیتا جی دھرتی ماں کی بیٹی تھیں اور ساوتری ایک عام سنساری راجہ کی۔

ساوتری کے استقلال اور آہنی عزم کے سامنے یم راج نے بھی سر جھکا دیا تھا اور اُس کی محبت نے تقدیر کے لکھے تک کو بدل دیا تھا۔

ہم نے ہر یگ میں اچھی، وفاشعار اور نیک عورت کو سیتا ساوتری کے مقدس ناموں

سے بُلا یا اور یاد کیا ہے۔
ہماری دیو مالا میں کتنی ہی کتھائیں ہیں ایسی پتی ورتا دیویوں کی جن سے بھگوان بھی خوف کھاتے تھے۔
پنڈت رادھے شیا کتھا واچک نے وارتالاپ جاری رکھتے ہوئے کہا: آج بھی ہم سچی پتی ورتا استری کو ساوتری ایسی سادھوی کہہ کر اُس کا آدر ستکار کرتے ہیں۔ایسی استریاں ہر یگ میں ہوتی ہیں۔ کتنی ہی کہانیاں ہیں ایسی عورتوں کی جنھوں نے جب کسی مرد کو ایک بار من سے اپنا لیا تو اُسی کی ہو گئیں۔ سیتا، اہلیہ، گارگی، دامودری، دمینتی پرانے دیو مالائی نام ہیں، سنجوگتا تو ہماری جانی پہچانی اِتہاسک گاتھا ہے۔ایسی کتنی ہی عورتوں کے قصے ہمارے آج کے ساہتیہ میں بھی ہر سُو بکھیرے پڑے ہیں جیسے شرت کی بیراج۔ آپ شانتی کو نہیں جانتے۔ شانتی تاریخ یا کسی دیو مالائی کتھا کا کردار نہیں ہے۔ایک عام سیدھی سادھی عورت کو ساہتیہ میں کون جگہ دے گا....
مگر شانتی کوئی معمولی عورت نہ تھی۔ وہ دیو مالا ہی کی ایک شہزادی تھی، جو پیدا البتہ ہمارے آپ کے یگ میں ہی ہوئی اور اسی یگ کے ایک ایسے معمولی آدمی کے لیے مرمٹی جسے اُس نے من دھرم اور وچن سے سوامی سویکار کر لیا تھا۔
آزاد یگ کے اِس دور میں شانتی کی کہانی میں آپ کو وہ رَس نہ ملے گا جو منٹو کی غیر سعادت مند عورتوں کے تذکروں میں ملتا ہے۔اُن عورتوں کا بھی اپنا ایک مقام ہے۔ میں اُن کی حقیقت کو نہیں جھٹلاتا۔ عفت و عصمت میرے نزدیک بڑے اچھے اور پاکیزہ وصف ہیں مگر میں کچلی ہوئی عصمتوں کو بھی شفقت کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہوں۔
اچھی نیک دل خدمت گزار اور شوہر سے محبت کرنے والی عورت جو ہر قسم کی محرومی کے باوجود عزت و ناموس کی چادر اوڑھے پڑی رہتی ہے جھوٹی یا غیر فطری شئے نہیں۔ ایک سچائی ہے۔
عورت بیوی بن جاتی ہے تو شوہر کی کمائی پر اُس کا اتنا ہی حق ہو جاتا ہے جتنا خود کمانے والے کا۔ ایسی عورت کو مرد کی دستِ نگر کہنا ٹھیک نہیں۔ یہ یگوں سے چلی آ رہی ایک

عظیم قدر ہے جسے محض نبھا نہ سکنے کی وجہ سے ہم غلط رنگ میں دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ شادی کرنا اور نبھانا بڑی ہمت، بڑے حوصلے اور استقلال کا کام ہے۔ یہ بزدلی یا پست ہمتی کا راستہ نہیں۔ بلندیوں کی طرف جاتی ہوئی ایک عظیم شاہراہ ہے جس کے چاروں طرف زندگی کی اپسرائیں اپنے تمام تر رنگوں کی چنریاں اوڑھے ناچتی گاتی گنگناتی دکھائی دیتی ہیں۔

مگر میں کہاں بھٹک گیا۔ میں تو بس سیدھے سادے الفاظ میں آپ کو شانتی اور امرناتھ کی جیون یاترا کی کچھ جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں جو میں نے دیکھی ہیں اور متاثر ہوا ہوں۔ اپنی اور آپ کی زہریلی زندگیوں میں تھوڑا شہد تھوڑا امرت گھول دوں اور آپ کو کسی طرح یقین نہ دلا سکوں تو کم از کم بتا ہی سکوں کہ ساوتری آج بھی ایک زندہ حقیقت ہے۔ ایک آدرش جو ہر یگ میں عزت واحترام سے دیکھا جائے گا۔

آیئے اس کہانی کو وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں وہ ختم ہوتی ہے شانتی منتر....اوم شانتی....شانتی........شانتی اوم۔

اے دُکھوں کے ہرنے والے پربھو۔ ہوا پرتھوی اور جل کے بھیتر جو انیک پدارتھ اور ہمارے اُوپر جو آکاش ہے اور ہماری دھرتی کے جو گیانی پُرش اور براہمنڈ کے جو دیوتا ہیں وہ سب ہمارے لیے سکھ کاری ہوں اور ہمارے چاروں طرف شانتی کا باس ہو۔ اوم....شانتی....شانتی....شانتی.......اوم۔

مگر شانتی کہاں تھی۔ اُس کا سارا شریر جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ دایاں بازو البتہ جھلس تو بُری طرح گیا تھا۔ مگر بھسم ابھی نہیں ہوا تھا۔ ڈھیروں گھی کی آہوتیوں کے باوجود اگنی ڈھنگ سے بھڑک نہ پائی تھی۔ تازہ جنگلی لکڑی جس کا ریشہ ریشہ پانی سے شرابور تھا جلتی بھی تو کیسے۔

ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ آگ کو پوری طرح سے بھڑکانے کے لیے مٹی کا تیل ڈالا جائے مگر امرناتھ نہ مانا۔ ''اور کچھ سوکھا اِس دیواستھان میں نہیں ہے تو مجھے ہی اس کے ساتھ جلا دو۔''

مشورہ دینے والے اور وہ خدا ترس بنیاد جو گرد ونواح میں مٹی کے تیل کا واحد

بیوپاری تھا اور سوہی روپیوں میں تیل کا پورا ٹین دینے کو تیار ہو گیا تھا۔ چپ ہو گئے۔

برف بدستور پڑ رہی تھی۔

بھگوان کیدار ناتھ کے مندر میں ایک بڑا پریوار بچے کا نام سنسکار کرنے آیا ہوا تھا۔ ضروری تھا کہ شانتی کا واہ سنسکار پورا ہو جائے، نہیں تو ان بیچاروں کے شگن میں بادھا پڑنے کا ڈر تھا— موت کے سامنے کس کا بس چلتا ہے۔ وہ لوگ بھی چپ تھے۔

''کیا جگہ چنی ہے بھاگیہ وتی نے مرنے کے لیے۔''

''بڑے بھاگیہ ہوتے ہیں بھیا، جبھی کوئی اس طرح جاتا ہے۔''

خوشی خوشی دیواستھانوں کی یاترا کرنے آئی تھی پتی اور پریوار کے ساتھ۔ ہردی دوار سے ہوتے ہوئے وہ لوگ بدری ناتھ گئے تھے اور اب لوٹتی بار کیدار ناتھ آئے تھے۔

مندر سے ایک آدھ میل اُدھر ہی گھوڑے کے اچانک پھسل جانے سے امرناتھ نیچے کھائی میں گر گیا تھا اور پھر جو لڑھکا تو لڑھکتا ہی چلا گیا نیچے ہی نیچے۔ ساتھ میں درجنوں لوگ تھے مگر اُن میں سے ابھی کوئی کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ شانتی جو اپنی باری سے اب پیدل چل رہی تھی دیکھتے ہی دیکھتے پتی کی جانب بھاگی اور اُسی کی طرح نیچے کھڈ میں لڑھکتی چلی گئی۔ دونوں تقریباً ایک ساتھ ایک بڑے بڑے پیڑ کے تنے سے جا لگے۔

حیرت تھی کہ امرناتھ کو تو چوٹیں آئی تھیں مگر شانتی کے نرم و نازک جسم پر ایک معمولی خراش بھی نہ آئی تھی۔ منزل پر پہنچ کر رات بھر وہ پتی کے جسم کو سہلاتی اور اُس کی خراشوں پر مرہم کا لیپ کرتی رہی۔

پھر جو سوئی تو اُٹھی ہی نہیں ——

''یہ اُس کا پرانا انداز ہے۔ اُس کے جسم پر ایک معمولی خراش بھی نہ آئی تھی۔ ایسا ہوتا تو میں بھی اُس کے لیے کچھ کرتا.....

یہ مرنے کا کیا ڈھنگ ہے۔ اُس نے زندگی بھر میری سیوا کی مگر آخری بار بھی مجھے اپنے لیے کچھ کرنے کا موقعہ نہ دیا۔ میرے سامنے زخم اُس نے اپنے اوپر لے لیے۔ چپ چاپ۔ اس طرح کہ کسی کو کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ مجھے تو یہ چند عارضی خراشیں ہی آئی ہیں وہ تو

ظاہر ہے کہ اندر ہی اندر ٹوٹ گئی تھی ——

''حیرت ہے کہ اس بھاگیہ وتی کا دایاں بازو جل ہی نہیں رہا۔''

دیکھتے نہیں ہو پنڈت جی، دیدی کے بازو میں سہاگ چوڑی ہے۔'' شانتی کی چھوٹی بہن اندو چتا کے قریب کھڑی روئے جا رہی تھی۔

امرناتھ نے شانتی کی مرتیہ دیہہ سے ایک بھی زیور نہ اُتارنے دیا تھا۔ ''یہ سب اُسی کے ہیں اُسی کے ساتھ جائیں گے۔''

بیس تیس تولہ سونا اس مہنگائی کے زمانہ میں دس پندرہ ہزار کی چیز تھی ''مگر جو اپنا نہیں اُسے لینا کیا مناسب ہے —— جس کے لیے یہ سب تھا جب وہی نہیں رہی تو میں یہ سب لے کر کیا کروں گا۔''

—— ''یہی سب کچھ تو پیچھے نہیں چھوڑ گئی وہ۔''

لوگ جو وہاں جمع تھے اور امرناتھ کو جانتے تھے۔ جانتے تھے کہ امرناتھ کوئی جذباتی یا احمق قسم کا رئیس نہیں ہے۔ بڑے اصولوں کا آدمی ہے۔ مگر آج سب حیران تھے۔

اندو نے دیدی کے کپڑے اُتار کر نہلانا چاہا تھا مگر امرناتھ نے کہا تھا۔ ''نہیں اندو بہت سردی ہے۔ بے چاری کے کپڑے نہ اُتارو۔ گنگا کے جل میں ہر قسم کی میل دھوڈالنے کی شکتی ہے وہ تو صاف سوچھ آتما تھی۔''

''آج دادا کیسی باتیں کر رہے ہیں۔'' مگر اندو مان گئی تھی۔

آخر جب عناصر کا غضب کم ہوتا دکھائی نہ دیا تو امرناتھ نے وہ ادھ جلا بازو بیوی کی سلگتی چتا سے اپنے دونوں ہاتھوں میں اُٹھالیا۔ ایک بار اُسے ہونٹوں سے لگایا پھر ماتھے اور پھر جیسے آہوتی دیتے ہوئے گنگا میں بہا دیا۔

''لو میّا سنبھالو اپنی بیٹی۔''

سہاگن کا ہاتھ جلانہ تھا کتنے ہی قصے ہیں ہماری دیومالا میں اُن دیوآتماؤں کے جو شریر ساتھ پر بھودھام لوٹیں۔

''میں نے کہا تھا نا۔'' پنڈت رادھے شیام کتھاواچک نے بات جاری رکھتے ہوئے

کہا کہ شانتی کی کہانی بھی ایک دیو مالائی کہانی ہے۔

ابھی کل کی بات ہے، سپنے میں یم راج آئے تھے۔

''کیا ارادہ ہے لالہ امرناتھ۔ بھرپور جئے ہو اب چلو گے نہیں۔''

''نہیں دیوا بھی نہیں۔''

''کیوں امرناتھ''

''میں اِسے'' ساتھ لیٹی ہوئی شانتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ ''بیاہ کر لایا تھا اور آپ کی قسم کھا کر اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے اپنے ہاتھوں وداع کروں گا۔''

''مگر اس کی عمر تو ابھی ہے۔''

''تو پھر میں مجبور ہوں دیو۔''

''تمہاری مرضی امرناتھ۔ ہم نے سوچا، تم نے سب کچھ تو کر لیا مزدوری، نوکری، دوکان داری چھوٹا بڑا ہر قسم کا بیوپار۔ بوریے پر پیدا ہوئے تھے۔ آج تمہارے ملازم بھی غالیچوں پر سوتے ہیں۔ ایک کھیتی رہ گئی تھی وہ ہوس بھی تم نے پوری کر لی اب اور کیا کرنے کا ارادہ ہے۔''

''بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی ہیں۔ ایک بیٹا ہے نیک سیرت سیدھا سادہ بچہ۔ اسے بیوپار کے دو چالو اصول سمجھا دوں۔'' امرناتھ نے شرارت سے آنکھ میچ کر دیو کو جھلایا۔

''تمہاری مرضی دوست، مگر دیوی کے بعد۔''

دھرم راج نے اُسے دوست کہا تھا اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ نہیں اِن کے بعد بھی نہیں۔ مایو جی بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اپنے سامنے مرنا برداشت نہ کر سکیں گے، پاگل ہو جائیں گے۔

''کوئی کسی کے لیے پاگل نہیں ہوتا امرناتھ یوں ہوتا تو پربھو کے لیے دُنیا چلانا محال ہو جاتا۔ خیر آج ہم ایسے ہی لوٹ جاتے ہیں۔ آج ہم محض یہ جاننے کے لیے نکلے تھے کہ کوئی اپنی مرضی سے بھی پربھو دھام جانا چاہتا ہے کہ نہیں ۔۔۔ دیکھتے ہیں آج ایسا کوئی جیو بھی نہیں۔''

وہ الٰہی نور جس سے کمرہ یکا یک ایک جگمگا اُٹھا تھا نہ جانے یکا یک کہاں لُپت ہو گیا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے سرکنے سے شانتی کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔

''ارے یہ کیا تمہارا شریر تو پسینے سے جیسے نہا سا گیا ہے۔'' شانتی نے بیڈ سوچ دبا کر کے کمرہ منور کر دیا تھا۔ ''یہ تمہارے چہرہ پر ایک بھیانک.....ڈر گئے تھے ـــــ سو بار کہا ہے کہ ہاتھ چھاتی پر رکھ کر نہ سویا کرو۔''

''تو پھر کہاں رکھا کروں۔''

شانتی شرما گئی تھی۔

پچاس سال کی اِس عمر میں بھی اس عورت کو شرمانا آتا تھا۔

''شرم وحیا کی دیوی ہے میری بہو''...... بابو جی کہا کرتے۔

''تو سدا سہاگن رہے'' مرتی ماں نے وردان دیا تھا۔ اس دنیا سے اپنے سچے دھام کو لوٹتے ہوئے یاتریوں کے آشیرواد میں بڑی ستا ہوتی ہے۔

''سوتے سوتے اچانک کاروبار کا خیال آ گیا تھا۔'' امرناتھ نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مگر اپنا شیام بیچارہ بڑا سیدھا بچہ ہے۔''

''اِس عمر میں بھی ایسے ہوتے ہیں۔ تم ہی کون اتنے ہوشیار تھے۔''

''سو تو ہے، مگر میرے پاس کھونے، گنوانے کے لیے کچھ نہ تھا اُس کے پاس لاکھوں ہیں۔''

''وہ تمہارا بیٹا ہے اپنی اولاد سب کو لولی لگتی ہے۔ کون جانے وقت آنے پر وہ تم سے بھی دو قدم آگے نکلے۔''

''مگر!!''

''مگر وگر کچھ نہیں جی۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ بھولو نہیں کہ میں بھی اس کی ماں ہوں ـــ ایک یگ پڑا ہے شامو کو بھی تیار کر لینا۔''

ـــ ایک یگ ـــ

پورا ایک یگ دان کر دیا تھا اُس نے اُس رات۔

کیدار ناتھ مندر کے بڑے پجاری جی بھگوان کی آرتی اُتار کر اب شانتی منتر کا جاپ کر رہے تھے۔ اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ پرارتھنا میں، بھگوان کی ارادھنا میں بڑی شکتی ہوتی ہے۔ پرارتھنا کے پنکھ پا کر آتما سورگ کی اور اُڑنے لگتی ہے۔ اُس نے دیکھا شانتی کی آتما مسکراتی اور آنکھوں سے اسیم پیار کی برکھا کرتی ہوئی پربھو دھام کی اور اُڑی جا رہی ہے اوپر ہی اوپر۔ اسے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ شانتی جس نے دھرتی پر بھی اپنا ایک سورگ بنا رکھا تھا۔ سورگ ہی کی کوئی اپسرا تھی—

مگر کل اور آج میں بڑا فرق تھا۔

کل وہ میرے گھر تھی۔ آج اپنے گھر چلی گئی ہے۔

—یہ آتمائیں روز روز گھر کیوں بدلتی رہتی ہیں۔

شانتی نے اپنی مختصر سی زندگی میں کتنے ہی گھر بدلے تھے۔

متھرا میں اپنے ماں باپ کا گھر جس کے کھلے آنگن میں کھیل کود کر وہ بڑی ہوئی، پھر آگرہ میں سسرال کا گھر۔ جہاں امرناتھ اُسے بیاہ کر لایا تھا۔ پھر کلکتہ، مدراس، پونا، بمبئی کے چھوٹے چھوٹے گھروندے۔ پیار کی اٹوٹ ڈور میں بندھی وہ سوامی کے ساتھ ہر اوبڑ کھابڑ ڈگر پر چلی تھی اور ہر کال کوٹھری کو اُس نے پیا کا گھر مان کر سجایا سنوارا تھا۔ زندگی کی اوّلین لڑائیوں میں یہ چھوٹے چھوٹے گھروندے امرناتھ کی پناہ گاہیں بنے۔ زندگی نے اُسے کتنی بار پچھاڑا۔ کتنی ہی بار وہ گھائل ہوا مگر جب اور جیسے ہی وہ تھک ہار کر گھر لوٹا، شانتی نے اپنے پیار کے مرہم سے اُس کے سارے زخم بھر دیے۔

زندگی پر چھائے ہر گہرے اندھیرے میں وہ ایک زندہ و تابندہ ستارے کی طرح چمکتی، جگمگاتی تھی۔ امرناتھ جب بھی اُسے دیکھتا اُسے لگتا کہ دنیا اتنی بُری نہیں جتنی دکھائی دیتی ہے۔

نہ جانے اُس کے بات کہنے کے ڈھنگ میں ایسا کون سا انوکھا وصف تھا کہ یہ

جانتے ہوئے بھی کہ وہ محض بہلانے اور ڈھارس دینے کے لیے یہ بات کہہ رہی اُس کی بات ہمیشہ سچ لگتی۔ ان چھوٹی باتوں کے رس میں زندگی کی ساری الجھنیں، گرہیں اپنے آپ کھلنے لگتیں اور گہرے کالے بادلوں سے گھری صبحیں بھی جگمگاتی مسکراتی دکھائی دیتیں۔

چالیس برس پہلے جب اس کا بیاہ ہوا تھا تو آگرہ کے بنیوں کے محلے میں اُس کی بہو کی سُندرتا کی دھوم مچ گئی تھی۔

''واہ کیا پیاری بھولی بھالی صورت پائی ہے۔''

''ساکشات لکشمی کا رُوپ''

''لگتا ہے بھگوان نے فرصت کے اوقات میں خود اپنے ہاتھوں سے گھڑا ہے یہ حسن کا پیکر۔''

''یہ لڑکی ہے کہ مورت۔ دیکھو تو کیسی گڑیا سی لگتی ہے۔''

''امرناتھ کا بھاگیہ کھل گیا۔''

''سنا ہے ڈھیر سا پیسہ بھی لائی ہے۔''

''مگر ایسے پیسوں سے کب کسی کا گزر ہوا ہے پیارے۔ دعا کرو کہ یہ نکھٹو خود سے بھی کچھ کھانے کمانے لگ جائے۔ نہیں تو ہاتھوں کی مہندی اُترتے اُترتے دُلہن کا یہ سارا رنگ روپ مٹی ہو جائے گا۔''

''ٹھیک کہتے ہو بھیّا ایک دھیلہ بھی تو کم بخت نہیں کماتا بس اکھاڑے میں بیٹھا صحت بنایا کرتا ہے۔''

''پیسہ تو پیسے ہی سے کمایا جاتا ہے۔ پیسے ہوتے تو لالہ جی بیٹے کو دوکان نہ کھلوا دیتے۔ بنئے کا بیٹا تو تم جانو دوکان پر ہی جچتا ہے۔''

جب چند ہی دنوں بعد کلکتہ سے نوکری کا بلاوا آ گیا تو امّی نے چہکتے ہوئے کہا ''دیکھا کتنی بھاگیہ والی ہے میری شانو بھابی۔ آتے ہی بھیّا کی تقدیر کے دوار کھول دیے۔''

''تیس روپیہ مہینہ اور کلکتہ جیسا بے مروّت شہر، بھئی میں تو مشورہ نہ دوں گا کہ لڑکے کو اتنی دور بھیجا جائے۔'' تاؤ جی نے چھوٹے بھائی کو مشورہ دیا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں بھائی صاحب۔تیس میں اپنا پیٹ ہی پال پائے گا۔ بہو بیچاری کیا اِدھر اکیلی رہے گی۔''

''لڑکا اکیلا ہے جانے کو راضی ہو جائے گا۔''

راضی کیسے نہیں ہوگا۔ بہو کو وہاں لے جا کر کیا کرے گا۔کہاں رہیں گے دو جنے۔ کیا کھائیں گے۔کیا پہنیں گے اور پھر ہم نے امتی بیٹی کی شادی بھی تو کرنی ہے۔''

شانتی نے کہا۔''تیس تو بہت ہوتے ہیں میں تمہارے ساتھ ان سے آدھے میں بھی رہ سکتی ہوں۔دو چار سال تو ہمیں کپڑے لتّے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔تب تک تمہاری ترقی ہو ہی جائے گی۔ میں بڑی بھاگیہ والی ہوں۔''

''سچ!!''

''تو کیا جھوٹ۔تمہارے ایسا سوامی پالیا اس سے بڑا بھاگیہ کیا ہوگا کسی کا۔''

تیس روپے آگرہ میں رقم ہو سکتے ہیں کلکتہ میں نہیں، پھر بھی امرناتھ شانتی کو ساتھ لے جانے کے لیے راضی ہو گیا۔

''سالا مجنوں ہے۔''

''زن مُرید!''

''ارے نہیں بھئی خون میں حرارت ہے چھوکرے کے۔ اکھاڑے کا پلا ہوا گبھرو جوان ہے،عمر بھی تو دیکھو۔''

''ایسی سندر جورو چھوڑ کر جانا بھی تو سہل نہیں بھیّا۔''

''رام سیتا کی جوڑی ہے میرے بھیّا بھابھی کی''اِمتی کی خوشی کی واقعی کوئی سیمانہ تھی۔

امرناتھ نے سب کی سنی۔سب سچ کہہ رہے تھے،مگر سب سے بڑا سچ تھا اُس کی اپنی بھرپور جوانی اور شانتی کا بے پناہ حسن۔

''اکیلا رہوں گا تو دن رات تمہارے ہی بارے میں سوچتا رہوں گا۔ٹھیک سے کام بھی نہ کرسکوں گا۔تم پاس رہوگی تو میری ہمت بندھاؤ گی۔کام میں من لگے گا تو کام اچھا ہوگا۔کام اچھا ہوگا تبھی تو مالک لوگ خوش ہوں۔ مالک خوش نہ ہوں گے تو ترقی کیوں کر

پاؤں گا۔"

"ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے۔" تاؤ جی اکثر کہا کرتے تھے۔

صداقت کیا ہے وہ نہیں جانتا، مگر تاؤ جی کی بات یقیناً سچی تھی اتنا تجربہ ہے اُن کا۔

ترقی۔ ترقی۔ ترقی وہ ضرور ترقی کرے گا۔ شانتی اُس کے پاؤ کی بیڑی نہیں اُس کے پر بننا بنے گی۔ اُس کی کمزوری نہیں اُس کی طاقت بنے گی۔ ہر بڑے آدمی.... آدمی وہی جانتا ہے جو وہ ماننا چاہتا ہے۔

جانے سے پہلے شانتی نے اپنے سارے زیور اُتار کر اماں کی جھولی میں ڈال دیے۔

"یہ اِمتی کے لیے ہیں اماں، میں نے منگل سوتر اور ہاتھ کی دو دو چوڑیاں رکھ لی ہیں۔ جو کافی ہیں۔"

کلکتہ میں انھیں ایک ہی ہفتہ دھرم شالہ میں رہنا پڑا۔ گھر مل گیا۔

"یہ سالا بھی کوئی گھر ہے۔"

"گھر کیوں نہیں ہے جی۔ تم ہو۔ میں ہوں۔ گھر میں اور کیا ہوتا ہے۔"

"تمھارے پتا کا گھر۔"

"بہت بڑا تھا مگر ہم بھی تو بہت جنے تھے۔ چھ بھائی بہن۔ دادا جی تاؤ جی اور..... یہاں تم ہو۔ میں ہوں اور ہمارے سر پر بھگوان کا سایہ ہے۔"

"کبھی کبھی تو تم سیتا ساوتری ایسی دقیانوسی باتیں کرنے لگتی ہو۔"

"تم اِسے دقیانوسی کہتے ہو کیا تم ان دیویوں کی حقیقت سے منکر ہو۔"

منکر کیوں کر ہوتا وہ، ہر یگ کا آدمی یہ مانتا ہے۔

"پتنی پتی کی سب سے سچی سلاح کار ہوتی ہے۔" تاؤ جی نے چوری سے اسے سو روپے تھماتے ہوئے کہا تھا "میں سب کے سامنے کچھ بھی کہوں۔ کوئی کچھ کہے، مگر شرمانا نہیں جھجکنا بھی نہیں، بہو کو ساتھ ہی لے کر جانا میں نے اس لڑکی کو ایک نظر دیکھ کر ہی پہچان لیا ہے۔ یہ تمھاری سب سے بڑی طاقت ثابت ہوگی۔" تاؤ جی کتنے مہان ہیں۔ امرناتھ کے

دل میں اپنے والد کے بڑے بھائی کے لیے اسیم شردھا تھی۔

نوکری کرتے اسے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ تنخواہ باقاعدہ ملتی تھی مگر آگے ترقی کا کوئی وسیلہ نظر نہ آتا تھا۔ کولہو کے بیل کی طرح صبح وشام وہ پیدل ہی دفتر آتا جاتا ایک دن بہت تھک کر لیٹ گیا۔

شانتی نے اس کے منہ پر ماتھے پر سر پر گیلا تولیہ ملا۔ جوتے اُتار کر اس کے پاؤں کو بھی ٹھنڈک پہنچائی اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ اب وہ کچھ سن سکنے کے موڈ میں ہے تو بولی ''ماں نے کہا تھا کہ تمہارا مرد جو کمائے اُس میں سے کچھ بچا کر ضرور رکھنا۔ تمہارے تیس روپیوں میں سے میں نے ہر مہینہ پانچ کے حساب سے پورے تیس بچا کر رکھے ہیں۔ گھر سے شگن کے بھی کچھ روپے میرے پاس ہیں۔ کل ملا کر پچاس روپے میرے پاس ہیں۔ چالیس بیالیس کا اچھا خاصا سائیکل آجاتا ہے۔ تمہارا اس طرح دھوپ میں روز چھ چھ میل آنا جانا مجھے اچھا نہیں لگتا جبکہ میں خود سارا دن آرام سے پلنگ پر لیٹی رہتی ہوں۔ سائیکل ہوگی تو ساتھ میں گھر کا پکا کھانا بھی ڈھنگ سے ڈبے میں بند کر کے دفتر لے جا سکو گے۔ وقت پر آؤ گے وقت پر جاؤ گے۔''

سائیکل آگئی۔۔۔

پھر ایک دن اُس نے کہا ''جب تک تم باہر رہتے ہو میرا بیکار من بلا وجہ بے چین سا رہتا ہے۔ سوچتی ہوں کیوں نہ تمہارا ہاتھ بٹاؤں۔ مشین تو اپنے پاس ہے ہی اگر تم اجازت دو تو کیوں نہ تمہارا ہاتھ بٹاؤں۔ پاس پڑوس کے لوگوں کے دو چار کپڑے ہی سی دیا کروں کبھی کبھی۔''

''اپنے جیتے جی میں تمہیں غیروں کا کام نہ کرنے دوں گا۔''

''یہ دوسروں کا کام تھوڑے ہوگا۔ اپنا کام ہوگا۔۔۔ بیوپار ہوگا۔ ہم بنیا لوگ ہیں بیوپار ہمارا دھرم ہے۔ ہمیں ادھر آئے آٹھ دس مہینے ہو گئے ہیں مگر اس بیچ ہم آگرہ دوبار ہی دس دس روپے بھیج پائے۔ وہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم سے اتنے عرصہ میں اتنا ہی بن پڑا۔''

''تم نے اپنے سارے زیور، سارا جہیز تو دے دیا تھا۔ وہ کیا کافی نہ تھا۔''

''وہ ہماری کمائی تھوڑے ہی تھی۔ جہیز تو انھیں کا تھا۔''

وہ چپ ہو گیا۔

یہ کیسی عورت ہے۔ ہر وقت دوسروں کا خیال۔

وہ کلکتہ پورے چھ سال رہے۔ اُسے ایک کے بعد ایک ترقی ملی اور وہ تیس روپیہ کی بجائے تین سو روپے مہینہ کمانے لگا۔ صاحب لوگ بہت مہربان تھے اس کے کام اور اس کی ایمانداری سے بے حد متاثر تھے۔ ادھر آگرہ والے بھی خوش تھے اور متھرا والے تھے۔ ان کی بیٹی نے بڑی شوبھا کمائی تھی۔ کون ماں باپ ایسی بیٹی پر ناز نہ کرے گا۔

کلکتہ کی فرم نے اُسے اپنی کئی برانچوں کا یکے بعد دیگرے منیجر بنایا اور وہ لوگ مدراس پونا اور بمبئی سے ہوتے ہوئے بالآخر دلّی پہنچ گئے۔

بیس سال کی اِس مسافت نے اُن کی کایا پلٹ دی تھی۔ دلّی پہنچ کر شانتی نے کہا ''یہ بھارت کی راجدھانی ہے۔ اب ہم یہیں رہیں گے، اور نہیں گھومیں گے۔ بہت کر لی غیروں کی نوکری تم نے۔ اَب ٹِک کر اپنا کام کرو۔ خوب اچھا سا بڑا سا گھر بناؤ۔ اب ہم دو نہیں پورے چھ ہو گئے ہیں۔ اب اماں بابو جی اور تاؤ جی کو بھی اکیلے آگرہ میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔''

ہر وقت دوسروں کا خیال۔

شانتی کے چاہنے کی دیر تھی کہ اُن کا اپنا کام بھی شروع ہو گیا۔ جیسا وہ چاہتی تھی ویسا گھر بھی بن گیا۔

''آدمی کے کام کا اڈہ گھر سے الگ ہونا چاہیے۔''

اُس نے چاہا ہی تھا کہ یہ بھی ہو گیا۔ یہ نئی بلڈنگ اُن کے اپنے رہائشی مکان سے دُگنی بڑی تھی۔ چھ فلیٹ اور پوری بارہ دکانیں۔ اس کا اپنا دفتر جو پہلے ایک دُکان میں تھا پھیلتے پھیلتے چھ دُکانوں میں بٹ گیا۔

سٹاف آیا گاڑی آئی، پھر دوسری گاڑی آئی پھر ایک ساتھ چار گاڑیاں آئیں۔

سب طرف چین کی بنسی بج رہی تھی۔

''اب اور زیادہ نہ مانگنا اپنی لکشمی ماں سے شانو وہ تم پر بہت مہربان ہیں مگر اب اور زیادہ سنبھالنے کی شکتی مجھ میں نہیں ہے۔''

''میں جو تمہاری شکتی ہوں۔ شکتی تو تمہارے چرنوں کی داسی ہے۔''

پنڈت رادھے شیام کتھا واچک نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا ''ایک دن میں نے کہا، تمہارے ہاتھ میں لوہے کو سونا بنانے کا جادو ہے یار امرناتھ۔''

''میرے ہاتھ میں نہیں رادھے بھیّا یہ کوئی دوسرا ہی ہاتھ ہے۔''

وہ دوسرا ہاتھ آج امرناتھ نے گنگا میا کے سپرد کر دیا تھا۔

ساوتری ستیہ وان کی پریم گاتھا امرناتھ کو بہت پسند ہے۔ اُسے یقین ہے کہ شانتی نے بھی ساوتری ہی کی طرح کا کوئی سودا دھرم راج سے کیا تھا اور جو زندگی وہ جی رہا ہے اس کی اپنی نہیں شانتی کی دی ہوئی ہے۔ اور شانتی آج بھی زندہ ہے۔

وہ یورپ یاترا سے لوٹا تو میں اس سے ملنے گیا۔ بچوں نے بتایا کہ دادو اوپر چھت پر ہیں ——

''ارے اس اندھیرے میں یوں چھت پر کھڑے کیا دیکھ رہے ہو امرناتھ، پورے دس منٹ سے کھڑا دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک ٹک اوپر ستاروں ہی کو گھورے جا رہے ہو۔''

''چراغ نہیں چاندنی تو ہے۔ میں اس مٹیالے اُجالے میں اُسی کو کھوج رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں دوست کہ وہ کہاں ہے۔''

''کون؟''

''میری تقدیر کا ستارہ''

''شانتی بھابھی؟''

''ہاں دوست تمہاری شانتی بھابھی اور میرے بھاگیہ کا نرنا یک ستارہ جس کے بغیر میں زندگی کی بھری محفل میں بھی آج اکیلا ہوں۔ آج میری حسرتیں اُس پھول کی طرح ہیں جو شاخ پر ہی مرجھا کے بکھر جاتا ہے۔''

''مرجھاؤ نہیں پیارے، مگر بکھرو ضرور بکھرو اور پھیلو تاکہ تمہارے اسیم پیار کی اس مہک سے میرے ایسے دوسرے بھی فیضیاب ہو سکیں۔''

''وہ خود تو چلی گئی مگر اپنی برکتیں یہیں چھوڑ گئی۔''

''وہ گئی کہاں ہے پیارے وہ تو تمہارے اپنے اندر سمائی ہوئی ہے۔ اُسے باہر کہاں ڈھونڈو گے۔''

''میں سمجھتا تھا کہ اُس کے جاتے ہی سب پھر ویسے کا ویسا ہی ہو جائے گا۔ مگر شکر ہے بھگوان کا سب اُسی طرح چل رہا ہے بلکہ پہلے سے بھی بہتر چل رہا ہے۔''

''وہ آج تم میں اور تمہارے بیٹے بیٹیوں میں ہی نہیں تمہارے سارے خاندان میں سما گئی ہے۔ وہ تمہاری میری طرح اس نشٹھر دھرتی کا بوٹا تھوڑے ہی تھی۔ وہ تو ایک دیو شکتی تھی جو آشیرباد بن کر اس گھر کے در و دیوار میں اس کی ساری فضا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رچ بس گئی ہے۔ اب خود ہی دیکھو نہ بھائی کہ تم کیا تھے اور آج کیا ہو۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہو اور میرے ایسے تمہارے درجنوں ساتھی آج بھی زندگی کے چوراہوں پر کھڑے ہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ کون راستہ کدھر کو جاتا ہے۔''

امرناتھ نے بھرپور ٹھنڈی سانس لی اور دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔ جب کچھ دیر بعد اس نے آنکھوں سے ہاتھ اُٹھائے تو اس کی پلکوں میں جھلملاتے ہوئے شبنمی ستاروں کی لَو بتا رہی تھی کہ اُسے محبوب کا دیدار ہو گیا ہے۔ اب وہ آنکھیں ٹھہرے ہوئے ساکن پانی کی چند لمحے پہلے والی خاموش جھیلیں نہ تھیں۔ وہ عمیق اور اتھاہ سمندر تھیں جنھیں کوئی طوفان نہیں ڈرا سکتا۔

وہ ہر رات مجھے بلاتی ہے۔ اسی طرح ہر بار اِسی طرح۔ یہ وہ نشا منتر ن ہے جو ہر شام مجھے نئے حوصلوں، نئے ولولوں سے جینے کا درس دیتا ہے۔

⊙⊙

باب تمثیلات:

کال چکّر	:	بلراج ورما
موت پر فتح	:	جیالال سازؔ

کال چکّر

یہ ایک مختصر سی تمثیل ہے، جسے ایک کہانی کے طور پر لکھنے کی بجائے میں نے ایک یک بابی ڈرامے یا طویل مکالموں کے انداز میں لکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے آرام کرسی یا پلنگ پر لیٹے لیٹے عام قاری کی طرح پڑھنے کی بجائے ایک ڈائیلاگ اور کھیل تماشے کے طور پر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتے دیکھا جائے تاکہ میرے مقصد کی پوری صورت گری روبرو آجائے۔

محبت اور نفرت کے جانے مانے ولولے کے علاوہ اس کے تانے بانے میں چند دوسری انسانی کمیوں اور کمزوریوں کے جو عناصر چلے آئے ہیں تو بلاوجہ نہیں۔ ہم جس دَور اور معاشرے کے باسی ہیں اور جس قسم کی زندگیاں جینے پر مجبور ہیں ان کی چرچا ہوگی تو اِن کا ذکر بھی اپنے آپ ہی چلا آئے گا۔

میں خاصے لمبے عرصہ تک مرکزی سنگیت ناٹک اکادمی کے مشہور عالم انگریزی سہ ماہی سنگیت ناٹک کا مدیر پبلشر اور پرنٹر رہا ہوں لہٰذا جانتا ہوں کہ تمثیل محض لیکھک ہی کی تخلیق نہیں ہوتی بلکہ اپنا مقصد سمجھانے کے لیے اِسے ایک اچھے ہدایت کار یعنی ڈائریکٹر کی فنکاری کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے وقت، لباس، پس منظر یا مکالموں کی ادائیگی وغیرہ کے بارے میں اپنی جانب سے کسی قسم کی تفصیلی ہدایات تجویز نہیں کیں۔ اس تمثیل کی پروڈکشن کی ساری ذمہ داری میں پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور اداکاروں پر چھوڑتا ہوں، وہ جیسے چاہیں وقت کی سمت و رفتار اور اپنی نجی پسند، آواز اور سہولیت کے مطابق اِسے پیش کریں۔

کہانی کا لیکھک اپنی تخلیق کے بارے میں اپنی بات کہنے کا حقدار ہوتا ہے مگر تمثیل نگار کو اس قسم کا حق نہیں ہوتا نا ہونا ہی چاہیے۔

اسے کتابی صورت میں منظرِ عام پر لے آنے میں مجھ سے کہیں زیادہ مسز ورما اور ہماری بیٹیوں کا جذباتی اشتراک شامل ہے۔ میں ان سب کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔

اب چونکہ یہ تمثیل ایک کتابی سلسلے کا حصہ ہے، جواب آپ کے رُوبرو ہے لہٰذا پسند ناپسند کا حق بھی اب آپ ہی کو ہے۔

بلراج ورما

کردار

(بڑے)

رانی — (رانو۔رانی ماں)

راجو — راجندر کمار راٹھی

ملازم نمبر ۱

ملازم نمبر ۲

سیٹھ مایاداس راٹھی

(بچے)

وشال

ویشالی

نمی

کال چکر

(ایک تمثیل دَرد کی)

رانی : ہیلو راجو

راجو : او۔ہیلو

رانی : تم نے مجھے پہچانا نہیں۔

راجو : تم — تم — رانی — تم رانی
— رانو ہی ہو نہ؟

رانی : مجھے۔یوں۔اس طرح زندہ دیکھ کر
تمہیں حیرت ہو رہی ہے؟

راجو : حیرت تو ظاہر ہے کہ ہو ہی رہی ہے
مگر زندہ دیکھ کر نہیں۔ حیرت ہو
رہی ہے تمہارے اِس بھرے بھرے
گدرائے بدن کو دیکھ کر۔ اس
نئے انوکھے رنگ روپ کو دیکھ کر۔
اس قیمتی لباس اور اسے پہننے کے
اس غیر معمولی سلیقہ کو دیکھ کر —

کہاں وہ غریب رانو——

رانی : اور کہاں یہ راج رانی۔ تم اپنی رانو کو
زندہ دفن کر کے بھاگ گئے تھے،
مگر رانی کو نہیں۔ راج رانی ابھی زندہ ہے——

راجو : مجھے واقعی تعجب ہو رہا ہے——
یہ انقلاب ہے——

رانی : جسے تم زندہ باد نہ کہو گے۔

راجو : نہیں ایسی کوئی بات نہیں——
پانچ سال کا وقفہ——پانچ سال
میں اس قسم کی تبدیلی انقلابی ضرور
ہے مگر اتنے لمبے عرصے میں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے——

رانی : جو ہو گیا ہے——

راجو : پھر بھی۔ یہ زیورات۔ یہ قیمتی پارجات۔ اٹھنے بیٹھنے کے یہ تیور اور بات کرنے کا یہ حاکمانہ انداز——

رانی : سیٹھ مایاداس جی کہ چہیتی بیگم کے لیے یہ ٹھاٹھ باٹھ کوئی ایسا زیادہ تو نہیں——

راجو : تو تم نے——

رانی : تمیز سے بات کرو نوجوان یہ تُو اور تُم کسی اور کے لیے رکھ چھوڑو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔

راجو : تو اب مجھے اپنے ہی گھر کی ایک حقیر ملازمہ کی حرامی بیٹی سے آداب سیکھنے ہوں گے——

رانی : (طنزاً) تمہارا گھر؟ یہ تمہارا گھر، میرا گھر ہے——میری ماں جس نے دنیا دیکھی

تھی مرتے مرتے مجھے اپنی جگہ سنبھال گئی تھی اور وہ سارے گُر بھی ذہن نشین کرا گئی تھی جو مایاداس جیسے ہوس کے کیڑے کو آسانی سے منہ مانگے داموں بیچے جا سکتے ہیں—

راجو : تو تم نے میرے باپ کو— بیٹے کے بعد باپ کو—

رانی : تم نے مجھے جو سکھایا تھا میرے کام آیا اور جو ماں نے سکھایا تھا وہ بھی— تم نے مجھے ورغلایا تھا بدلے میں میں نے تمہارے باپ کو پھانس لیا۔ اب میں تمہاری ماں بھی ہوں اور تمہارے بیٹے کی بھی جسے تمہارا باپ اپنی ناسمجھی میں اپنا بیٹا سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہاری دو بہنیں بھی ہیں۔ بدلے رشتوں کی یہ تصویر تمہارے کند ذہن میں بیٹھی ہے کہ اور تفصیل سے سمجھاؤں—؟

راجو : میری ماں— میری اپنی ماں کہاں ہے—

رانی : وہاں اوپر— اپنے آبا کی حویلی میں، اپنے بنانے والے کے پاس— تمہارے امریکہ چلے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد— جب اسے میرے اور تمہارے باپ کے نئے تعلقات کے بارے میں پتہ چلا تو بیچاری بڑھیا برداشت نہ کر پائی—

راجو : میری ماں نے خودکشی کر لی تھی۔

رانی : وہ خودکشی کر لیتی تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر پاتی۔ ایک رات اس نے مجھے اپنے شوہر کے بستر میں دیکھا اسی وقت اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ بڑی خوددار عورت تھی تمہاری ماں، مگر اس نے تم جیسے ذلیل پلّے کو جنم دیا۔ کیسے کیسے حادثات سے بنتی ہے زندگی کی داستان— تمہاری ماں کے مرنے کے بعد ایک ہی مہینے کے اندر اندر ہم نے شادی کر لی۔ پورے ریتی رواج سے— ساری دنیا کے سامنے— تمہارا سماج— تمہاری ساری برادری میرا احترام کرتی ہے۔ تمہارے کارخانوں کے ورکر مجھے رانی ماں کہہ کر بلاتے ہیں—

راجو : تُم — تُم —؟

رانی : پھر وہی تُم ۔ پورے آٹھ سال امریکہ میں رہ کر بھی تم نے بات کرنے کا سلیقہ نہیں سیکھا۔ تم نے اور بھی کچھ سیکھا ہے کہ نہیں میں نہیں جانتی مگر اس طویل عرصہ میں میں نے تمہارے جیسے درجنوں فارن ریٹرن ملازم رکھ کر جتنا سیکھ اور جان لیا ہے اتنا تم بھی غالباً نہیں جانتے— میری ماں بدقماش تھی، مگر تھی خاصی سمجھدار اس نے رودھو کر کسی طرح مجھے بارہ جماعتیں پڑھا دی تھیں جو میرے جیسی ذہین لڑکی کے لیے کافی تھیں۔ تمہارا باپ تو چھٹی تک بھی نہیں پڑھا—؟

راجو : جوان بدن کی گندھ میں جو جادو، جو طلسم ہوتا ہے میں اس سے واقف ہوں—

رانی : بدن جوان ہو، تندرست اور توانا ہو، خوب صورت بھی ہو تو یہ جادو بلند آواز گونجتا ہے ایک خبیث بڈھے پر کیسے اثر انداز نہ ہوتا—؟

راجو : میرا باپ تمہاری نظر میں ایک خبیث بڈھا ہے؟ وہ کیمیا گر جو مٹی سے سونا بنانے کے سارے فارمولے جانتا تھا۔

رانی : اب ساتھ والے کمرے میں مٹی کا مادھو بنا بیٹھا ہے۔ مغلئی کھانوں اور قیمتی شراب کے علاوہ بھی اب وہ کسی شئے کو جانتا پہچانتا ہے تو وہ میرا بدن ہے۔ میں نے اس کی حکومت سنبھال لی ہے۔ اور اسے ہر قسم کے تفکرات سے آزاد کر دیا ہے۔ چھینا جھپٹی سے نہیں، اُسی کے اصرار پر میں نے اُسے جہانگیر بنا کر تختِ طاؤس پر بٹھا دیا ہے، اور خود نور جہاں بن کر اس کی انڈسٹریل ایمپائر کو چلانے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ اب تمہارا آبائی کاروبار وہ نہیں میں چلاتی ہوں۔ لاکھوں کا کاروبار اب کروڑوں کا ہو چلا ہے اور بدستور پھیلتا جا رہا ہے۔

راجو : تم بھولتی ہو رانی۔ میرا باپ مجھے کبھی نہیں بھولا۔ جس دریا دِلی سے اس نے مجھے امریکہ میں سپورٹ کیا ہے تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتی ہو۔

رانی : (قہقہہ لگا کر) تمہیں روپے باقاعدگی سے پہنچتے رہے۔ مگر تمہارے باپ نے کبھی ایک خط بھی نہیں لکھا تمہیں؟ بڑے احمق ہو۔ تم وہاں مزے سے رہو۔ یہاں سے دور رہو اسی لیے میں تمہیں تمہاری مناسب ضروریات سے تگنے چوگنے روپے بھجواتی رہی۔ تمہیں تو تمہاری ماں کے مرنے کی خبر بھی نہ دی گئی تھی مبادا تم سب چھوڑ چھاڑ کر لوٹ آؤ اور کباب میں ہڈی بن جاؤ۔

راجو : حرام زادی؟

رانی : (قہقہہ لگا کر) تم نے اپنے طور پر مجھے گالی دی ہے، مگر یہ گالی نہیں یہ حقیقت ہے کہ میں حرام کی اولاد ہوں۔ مجھے میری ماں نے میرے باپ کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ شاید وہ خود بھی نہ جانتی ہو کہ میرا باپ کون تھا۔ مگر میرا حرامی ہونا میری کمزوری نہیں میری اصلی طاقت ہے۔ میرے کردار میں وہ حیا نہیں رہی جو شریف زادیوں کا زیور سمجھی جاتی ہے۔ حرامیوں کا کوئی سماج نہیں ہوتا۔ کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ کسی قسم کی مان مریادہ نہیں ہوتی۔ شاید بھگوان بھی نہیں ہوتا۔ میری اپنی نظر میں میرا اپنا کوئی ہے تو وہ میری خبیث روح ہے جو بدشکل اور بدکردار ہوتے ہوئے بھی تندرست اور توانا ہے اور اب میری سچی محافظ ہے۔

(موسیقی کی دُھن، تلخی کو نرمی میں بدلنے کے لیے)

راجو : تم کتنی بدل گئی ہو۔ تمہارے اس کایا کلپ کا ذمہ دار میں ہوں۔ کبھی تُم کتنی سیدھی سادی، بھولی بھالی تھیں!

رانی : ایک عمر تک ہر انسان سیدھا سادھا اور بھولا بھالا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے تعلقات کے اوّلین دور میں جب تم نے میری جانب پہلا قدم بڑھایا تھا تو اس میں خلوص کی کمی نہ تھی ــــ وہ ایک سچے عاشق معشوق کا رشتہ تھا اور میں تمہاری داشتہ نہ

تھی تمہاری رانو تھی تمہاری اپنی رانو — اس کا ثبوت ہمارا بیٹا ہے، جو جھوٹی واسنا کی نہیں، سچے پیار کی اولاد ہے۔ وہ شکل وصورت سے ہی نہیں سیرت سے بھی فرشتوں کی اولاد لگتا ہے۔

راجو : کیا نام رکھا ہے؟

رانی : نام تو تم نے ہی تجویز کیا تھا۔

راجو : ارے ہاں یاد آیا۔ میں نے تمہارے پیٹ کو پیار سے ایک بار سہلاتے ہوئے کہا تھا ''تو غم نہ کھا رانو۔ میرا پیار سچا ہے۔ میں تجھے دھوکا نہ دوں گا۔ تیرے پیٹ میں جو چل رہا ہے وہ نگر سیٹھ مایا داس کا پوتا اور ان کے اکلوتے وارث راجندر کمار راٹھی کا فرزند ہے وہ کوئی معمولی شئے نہیں۔

رانی : (ہنس کر) اور میں نے کہا تھا اگر فرزندی ہوئی تو؟

راجو : مجھے سب یاد آ رہا ہے۔ میں نے کہا تھا تیرا مطلب لڑکی ہے نہ۔ تو بھی غم نہیں۔ لڑکی تو گھر کی لاج ہوتی ہے۔ اور تبھی میں نے دو نام تجویز کیے تھے۔ لڑکا ہوا تو وِشال اور لڑکی ہوئی تو ویشالی۔

رانی : تمہیں یاد ہے وہ رات۔ برسات کی وہ کالی ڈراونی رات۔ کیسی موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ کیسے گھنے بادل چھائے تھے آسمان پر۔ اور کتنی خوفناک تھی بجلی کی وہ کڑک جس سے ڈر کر میں چھپکلی کی مانند تمہارے چوڑے اور مضبوط سینے سے چمٹ گئی تھی۔

راجو : اور میں نے تمہیں اپنے ساتھ اور بھی زور سے چمٹاتے ہوئے کہا تھا۔ ڈر نہیں رانو۔ یہ بادل جلد ہی چھٹ جائیں گے اور چاند کی مہربان کرنیں بادل کی اس اندھی اندھیری کالیما کو چیر پھاڑ کر رکھ دیں گی۔ اور رات ہمیشہ کی طرح پھر سے منوّر ہو جائے گی۔

رانی: میں جانتی تھی کہ تم جھوٹ بول رہے تھے اور اماوس کی راتوں میں چاند نہیں نکلتا۔ مگر میں اپنی الّھڑ مستی میں وہیں چمٹی بیٹھی تمہارے جوان بدن کا رس چوستی رہی تھی۔ پانی برستا رہا تھا اور ہم تم بھی برستے رہے تھے۔

راجو: اُس رات میں خود تمھیں تمہاری ماں کے کمرے میں لوٹانے گیا تھا۔ تا کہ بڑھیا ہمارے تعلقات سے واقف ہو جائے۔ ہم دونوں بھیگے ہوئے تھے۔ اندر باہر سے پورے طور پر شرابور۔

رانی: اس روز ماں اپنے کمرے میں نہ تھی۔ ایسی راتوں کو اُسے مالک کی خدمت کے لیے اکثر رُک جانا پڑتا تھا۔ بے چاری ماں۔

راجو: میرا باپ — لوہے کو سونا بنانے والا کیمیاگر۔ مٹی سے ہیرے جواہرات اور موتی اُتانے والا جادوگر۔ ایک نظر دیکھ کر ہی سارے منظر کو بھانپ جانے والا دانشور وہ اپنے بیٹے کو جانتا تھا۔ اپنے خون کا رنگ پہچانتا تھا۔ تیری ماں کو تو جانتا ہی تھا۔

رانی: میری ماں اس کے لیے وہی تھی جو تمہارے لیے میں تھی۔

راجو: یہ گالی ہے رانو اور تم جانتی ہو کہ یہ جھوٹ ہے۔ تمہاری ماں میرے باپ کی داشتہ نہیں جب کہ تم میری محبوبہ تھیں اور میں نے تمھیں اپنی پتنی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رانی: جو ظاہر ہے کہ انھیں یعنی سیٹھ مایا داس کو منظور نہ تھا۔

راجو: میرے والد بڑے سمجھدار اور سلجھے ہوئے ذہن کے مالک تھے۔ وہ بھانپ گئے تھے کہ تم سے میرا لگاؤ ایسا نہیں، جسے ڈرا دھمکا کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اُنھوں نے مجھے چپکے سے پرے سرکا دیا۔ کوئی گلہ شکوہ کیا نہ کوئی ایسی بات ہی کہی کہ جس سے مجھے شک ہوتا کہ میں کسی خاص مقصد سے باہر جا رہا ہوں۔ مجھ سے جو کہا گیا تھا ہر اعتبار سے معقول تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ چونکہ میں نے یہاں کی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ مجھے اب امریکہ جانا ہوگا کیونکہ اُن کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے کاروبار کو

اب پرانے حربوں سے سنبھالا نہیں جاسکتا۔ اتنی بڑی انڈسٹریل ایمپائر کو سنبھالنے اور مزید سجانے سنوارا اور آگے بڑھانے کے لیے اب نئی جانکاری اور نئے تیکنیکوں کی ضرورت ہے اور یہ نئی ٹیکنالوجی صرف امریکی ادارے ہی سکھا سکتے ہیں۔

رانی: باپ کے مشورے میں تم نے اپنی نجات دیکھ لی چپ چاپ امریکہ چلے گئے۔

راجو: تم پھر جھوٹا الزام لگا رہی ہو۔ چپ چاپ چوری چھپے بھاگ جاتا تو تم اِس قسم کا الزام لگانے میں حق بجانب ہوتیں۔ مگر میں نے تو ساری سکیم تمہارے سامنے کھول کر رکھ دی تھی۔ مجھے سب یاد ہے۔ حیرت ہے کہ تمہیں کچھ بھی یاد نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ میں تمہیں امریکہ منگوا لوں گا تا کہ ہمارا پہلا بچہ امریکہ کی سرزمین پر پیدا ہو۔ کیونکہ امریکہ ہی دنیا کی ایک ایسی واحد جمہوریت ہے جس کی آزاد فضا میں ہر ماں یہ خواب پالنے کا حق اور دم رکھتی ہے کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر ملک کا پہلا شہری بنے گا۔

رانی: جانے سے پہلے تم نے مجھ سے گندھرو واہ کیا تھا۔ ہندو شاستروں میں ایسے وِواہ کی مناہی نہیں۔ اور ہم نے پورے سات دن کھنڈالہ کے سرکٹ ہاؤس میں ہنی مون منایا تھا۔

راجو: سات نہیں پورے نو دن۔ تمہاری یادوں میں زنگ لگ گیا ہے۔ مگر مجھے سب یاد ہے۔ امریکہ پہنچتے ہی مجھے اطلاع ملی کہ تم اور میری ماں اب دنیا میں نہیں ہیں۔ میرے پاس وہ تار آج بھی محفوظ ہے۔ ہندوستان میں تمہارے اور ماں کے علاوہ ایسا کچھ نہ تھا جو مجھے تعلیم ادھوری چھوڑ کر لوٹ آنے کے لیے مجبور کرتا۔ میں کئی ہفتوں تک پاگلوں کی طرح سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہا پھر آہستہ آہستہ یہ دیوانگی کم ہونے لگی۔ کوئی بھی جذبہ ایک جیسی شدت سے ہمیشہ بنا نہیں رہتا۔ پھر امریکہ تو لاکھوں نئی انوکھی دلچسپیوں کا گھر ہے۔

رانی: تم نے میرے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ مبادا تمہارے ہاتھ کی تحریر کوئی نیا فساد کھڑا

نہ کردے۔

راجو: خدا گواہ ہے کہ مجھے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ ملتا بھی کیسے تم تو مر چکی تھیں۔

رانی: تم ٹھیک کہتے ہو میں واقعی مر چکی تھی۔ ایک پکے ہوئے پھل کی طرح میں تمہارے پیڑ سے گری اور تمہارے باپ کے دامن نے مجھے مٹی ہونے سے بچالیا۔ میں ماں بننے والی تھی اور میرے بچے کو باپ کا نام درکار تھا۔ جو اسے آسانی سے مل گیا۔

راجو: تمہیں جو تکلیف اور پریشانی آج ہو رہی ہے میں اُسے سمجھ سکتا ہوں۔

رانی: مجھے وہ دن کبھی نہیں بھولے گا جب تم نے اپنے گھر کی پرانی نوکرانی کی کمسن اور معصوم بچی کو اپنی وِشال باہوں میں بھر کر اپنے چوڑے چکلے سینے سے کچھ ایسے چمٹالیا تھا کہ بیچاری کنواری کے پاؤں تک سلگنے لگے تھے اور بدن کے بھیدوں سے ناواقف اس کا ناتجربہ کار دِل تمہارے پہلے ہی بوسے سے ہزار ہزار بار دھڑک گیا تھا اور ایک عجیب انوکھی انجانی مستی بھری ترنگ میں بے سُدھ ہو کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں تاکہ اس کے بھیتر کی کنواری وہ سب نہ دیکھے جو اس کے بعد ہونا تھا—اور ہوا تھا۔

راجو: کیا عجیب جادو تھا وہ۔ ہائے وہ دِن!

رانی: تم نے میری خالی جھولی بھر دی تھی۔ ایک مفلس کنواری کی لاج تم نے اپنے پیار سے ڈھک دی تھی۔ اور وہ اپنے آپ کو ایسے محفوظ سمجھنے لگی تھی جیسے تم نے اسے کیچڑ سے اُٹھا کر پھولوں بھری سیج پر لٹا دیا ہو جیسے وہ تمہاری، نگر سیٹھ مایاداس کے اکلوتے بیٹے کی بیاہتا ہو۔

راجو: تم کیوں بار بار وہ مناظر یاد کرتی ہو۔ میں نے اس کے بعد بھی کتنی ہی بار تمہیں اپنی گود میں بٹھا کر تمہارے بدن کو سہلایا تھا۔ اُس سے جتنا سکھ مجھے ملتا تھا اُتنا، بلکہ اُس سے بھی کہیں زیادہ تمہیں مِلتا تھا۔ مرد اور خاص طور پر پیار کرنے والے مرد کی

گود میں جو نرمل آنند عورت کو ملتا ہے وہ اسے دوسری کسی جگہ نہیں ملتا۔

رانی: مجھے اعتراف ہے کہ تم ایک بھرپور مرد تھے۔ تمہارے بعد میں نے ایک دوسرے مرد کو بھی دیکھا ہے جو تمہارے مقابلے میں شاید آدھا مرد بھی نہیں۔ مگر اس نے مجھے پیار کے سکھ سے بھی بڑا تحفہ بخشا ہے۔ عزت، نام اور مان مریادہ کا تحفہ۔ اس نے مجھے میرا گھر دیا ہے۔ عورت کے نزدیک اس کے گھر کی کیا قیمت ہوتی ہے، یہ مرد نہیں سمجھ سکتے۔

راجو: تمہاری ماں کو جب ہمارے تعلق کی آگاہی ہوئی تو یاد ہے وہ کیسے چیخی چلائی تھی۔ وہ مکار بڑھیا۔

رانی: خوب یاد ہے۔ اس نے حقارت سے میرے منھ پر تھوک دیا تھا اور چیخ چیخ کر کہا تھا— تو سالی حرام کی اولاد ہے تو نے یہ سب کسی نہ کسی کے ساتھ کرنا ہی تھا۔ اب تُو بھی اپنے جیسا ایک حرامی پلاّ جن اور میری طرح کسی اوباش سیٹھ کی داشتہ بن جا۔ یا باہر جا کر جسم کا بیوپار کر۔ بہت مل جائیں گے تجھے راجو جیسے۔ ہر مرد چمار ہوتا ہے۔ چمڑے کا بیوپاری۔ تُو بھوکی نہ رہے گی۔ دو وقت پیٹ بھر کھانا اور راتوں کو کسی نہ کسی خبیث کے ساتھ سو کر اُس کے اور اپنے بدن کی دوسری مانگیں پوری کرنا۔

راجو: یہ بددُعا تھی، جو پوری نہیں ہوئی۔ کیونکہ بددعا دینے والی کوئی اچھی عورت نہ تھی۔

رانی: وہ اچھی تھی یا بری مگر میری جننی تھی۔ جب اس نے میرے مقدر، میرے مستقبل کا اتنا بھیانک تصور، میرے سامنے رکھا تھا تو میں نے بھی سوچا تھا کہ میری مقدس محبت کو اِس طرح ذلیل کرنے والی میری ماں نہیں ہو سکتی۔ مگر جب میں نے صورت حال پر دوبارہ سوچا تو مجھے اس کے لیے بس غصے کی حقیقت ایک دم سمجھ میں آ گئی۔ کبھی اس نے بھی کسی سے پیار کیا ہوگا اور دیکھ لیا ہوگا اُس پیار کا نتیجہ۔

راجو: تو اپنی ماں سے اس طرح اِس قدر کوسے جانے کے باوجود مجھ سے ملتی رہی تھی۔

رانی: عورت بدن کے بھیدوں سے ایک بار آشنا ہو جائے تو مجبور ہو جاتی ہے۔ مگر میں جسے پیار سمجھتی تھی وہ پوجا کے لباس میں ملبوس میری واسنا تھی۔

راجو: واسنا کا بھی اپنا ایک دھرم ہوتا ہے۔ واسنا تخلیق کی ماں ہے۔ واسنا جب اپنے لیے کچھ سیمائیں کچھ حد بندیاں مقرر کر لیتی ہے کسی ایک کو چاہت کا مرکز بنا لیتی ہے تو سماج اور خالقِ قدرت کے نر اور مادہ بنانے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

رانی: ان دنوں میں گھنٹوں سمندر کے کنارے بیٹھی اپنی تقدیر کی لہریں گِنا کرتی تھی۔ سمندری طوفانوں کو میں قدرت کے بے رحم عناصر کی فطری غضبناک سے تعبیر کیا کرتی تھی۔ اور اکثر ڈر جایا کرتی تھی۔ کبھی میں اکیلی ہوتی اور کبھی تم بھی میرے ساتھ ہوتے۔ تم مجھے تسلیاں دیتے۔ طرح طرح کے وعدے کرتے۔ مگر میرا خوف بنا رہتا کیونکہ ماں نے میرے ذہن میں بیٹھا دیا تھا کہ میں منحوس ہوں اور میرے بدن پر جو خبیث روح قابض ہے اسے ڈر ہے کہ اگر اس نے میرے جسم کو تیاگ دیا تو بھگوان اسے دوسری کوئی پناہ گاہ نہیں دیں گے۔ یعنی کہ مرنا بھی چاہوں گی تو مر نہ سکوں گی۔ اب تو خیر میں نے جینا سیکھ لیا ہے، مگر وہ دن — کیسے تھے وہ دِن!

راجو: میں نے خود گھوڑے کی سواری کبھی نہیں کی ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا نہ۔ مگر گھوڑوں کی دوڑیں دیکھ کر میں بے حد مسرور ہوتا تھا۔ دوڑ زِندگی کی علامت ہے۔ جوش کی علامت ہے۔ ایک ولولہ ہے۔ ایک پریرنا ہے۔

رانی: اب جب کہ میں وہ نہیں رہی جو کبھی تھی تو اب مجھے سمندر سے ڈر نہیں لگتا۔ اسی لیے میں نے تمہاری پرانی حویلی کو مسمار کرا کر اُس پر یہ فلک شگاف عمارت تعمیر کرائی ہے اور ہر منزل پر ایک ایسی بالکنی بنوائی ہے، جس سے سمندر کی بے چین لہروں کے تڑپنے کا نظارہ کر سکوں۔ سمندر اب مجھے خوف نہیں، حوصلہ بندھاتا ہے۔ ایک عجیب قسم کا سکون دیتا ہے۔ تم گھوڑوں کی دوڑیں دیکھ خوش ہوا کرتے تھے۔ کچھ

ویسی ہی راحت مجھے دوڑتی ہوئی ان آوارہ موجوں کے نظاروں سے ملتی ہے۔ تم نے گھوڑوں کی دوڑوں پر ہزاروں لگائے مگر کبھی کسی گھوڑے پر سوار نہیں ہوئے جبکہ میرے من نے اکثر چاہا ہے کہ میں کسی بڑی ویل کی پیٹھ پر سوار ہو کر دُور سمندر کی تہہ تک چلی جاؤں اور وہ سارے بھید جان لوں جو اس کے وِشال سینے میں یگوں سے غرق ہیں۔

راجو: تم اپنا توازن کھو بیٹھی ہو۔ تم اپنے آپ کو جتنی تندرست اور توانا سمجھتی ہو اُتنی ہی بیمار ہو — اور — اب تم کوئی ایسی زیادہ سُندر بھی نہیں ہو۔ امریکہ میں ہر تیسری عورت تم سے زیادہ خوب صورت اور طاقتور ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وہ کیا ہے۔ کیا چاہتی ہے۔ اسے کہاں تک اور کس رفتار سے جانا ہے۔ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ اور جس زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو وہ بیکار ہوتی ہے۔

رانی: تم میرے کرب، میری بیماری کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ درد یہ تڑپ کیسے اور کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اِس کا اندازہ بھی تم نہیں لگا سکتے۔ اِس درد و کرب کا منبع مجھے مل جاتا تو اسے اپنے اندر آج پل رہے ہزار سانپوں سے ڈسوا کر ڈھیر کر دیتی۔ مگر تم لوگ بڑے سیانے ہو۔ تم درد دیتے ہو، مگر درد کی شکایت سے، اس کے خدوخال سے اپنے مظلوموں کو کبھی آگاہ نہیں کرتے۔ مبادا اسے پہچان کر وہ غریب اپنی حفاظت کا انتظام کر لیں۔ یا تمہارا تحفہ قبول کرنے سے انکار ہی کر دیں۔

راجو: مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ تم بیمار ہو اور یہ کوئی معمولی بیماری نہیں۔ یہ بلڈ کینسر سے بھی خطرناک بیماری ہے۔ باہر سے تندرست اور توانا دکھائی دینے والی تُم اندر سے ایکدم خالی اور کھوکھلی ہو۔ اور تمہارے اس نئے اقتدار میں کوئی بھی محفوظ نہیں۔ نہ میں۔ نہ میرا باپ اور نہ ہمارا وِشال اور نا تمہاری دونوں بیٹیاں — تم نے ان کے نام —

رانی: بڑی کا نام ویشالی ہے اور چھوٹی کا نام ابھی طے نہیں کیا۔ فی الحال ہم اُسے نمی کہہ کر بلاتے ہیں۔ پہلے دونوں تم نے تجویز کیے تھے۔ یہ بھی تم ہی سجھا دو نا۔

راجو: یہ ادھیکار تُم مجھے دے سکتی ہو۔

رانی: میں نے تمہارا کوئی ادھیکار نہیں چھینا — نہ ہی چھیننا چاہتی ہوں۔ مگر اپنے ادھیکاروں سے سبکدوش ہونے کا بھی میرا کوئی اِرادہ نہیں۔

راجو: تم نے بیٹے سے اس کا باپ چھین لیا ہے۔

رانی: تمہارا باپ تمہیں ایک ہی شرط پر مل سکتا ہے۔

راجو: تمہاری کوئی شرط بھی ہے۔

رانی: تم اپنے باپ کی بیوی کو اپنی ماں کا رتبہ دو اور اپنے بیٹے کو اپنے چھوٹے بھائی کا۔

راجو: یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

رانی: تو پھر تمہیں کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ کیونکہ یہ گھر، تمہارے باپ کی ساری جائیداد، ساری ملیں، بینکوں میں پڑا سارا روپیہ میرے نام پر ہے۔

راجو: حیرت یہ سب کچھ حاصل کر کے بھی تم نے اُس بڈّے کو ابھی تک زہر نہیں دیا۔

رانی: جسے تم بڈّھا کہتے ہو۔ وہ تم جیسے سو جوانوں کا جوان ہے۔ وہ میرا پتی پرمیشور ہے۔ میری طاقت ہے۔

راجو: تمہاری زبان سے نکلے یہ الفاظ بے معنی ہیں۔ مگر تمہیں شاید ایسا نہیں لگتا۔ بیچاری ہوندوستانی ناری ہو نا۔

رانی: تم میں اتنی عقل نہیں ہے کہ تم عورت اور مرد۔ یعنی پتی اور پتنی کا رشتہ سمجھ سکو۔ کسی اچھے آدمی کی پتنی کہلانا جس عورت کا سب سے بڑا آدرش رہا ہو وہی بتا سکتی ہے اس رشتے کے مفہوم۔ ایک بے گھر فرد ہی گھر کے معنی سمجھتا ہے۔

راجو: تم عورت نہیں ہو کوئی چڑیل ہو۔ کوئی جادوگرنی ہو۔ آفت کی پرکالہ۔ تم ٹھیک کہتی

تھیں۔ تم واقعی کوئی خبیث روح ہو۔

رانی: تم پھر اپنے رنگ میں اپنے اصل روپ میں لوٹ رہے ہو۔ میرے زخم بھرنے لگے تھے کہ تم نے پھر انھیں کُرید کر تازہ کر دیا۔ تمہارا دیا ہوا درد سانپ کے زہر کی طرح میری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اور میں اب ایک ایسی وِش کنیا ہوں جس کی ہر سانس اب وہی زہر اگلنے لگی ہے۔ جو اسے تم سے ملا تھا۔ ہار، راجو میں اب واقعی ایک وِش کنیا ہوں۔ ایک نشہ، ایک جادو.... موت کا تانڈو۔

راجو: میں تمہاری حقیقت سمجھ گیا ہوں۔

رانی: اس پرانی حقیقت سے اس نئی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مجھے کیا کچھ نہیں کرنا پڑا۔ کیا کچھ نہیں سہنا پڑا۔ کن کن پُر پیچ مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ میں زندگی کی اِن اوبڑ کھابڑ راہوں میں کتنی بار لڑکھڑائی ہوں۔ کتنی بار زخمی ہوئی ہوں۔ کتنی بار کیسے کیسے روئی چلائی ہوں۔ یہ سب کسی نے نہیں دیکھا سوائے میری اس خبیث روح کے جس نے گہری سے گہری تاریکی میں بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میری اُلجھی راہوں کی اب یہی میری اصلی ماں، میری رہبر اور رہنما ہے۔ نہیں نہیں راجو تم آگے نہ بڑھو۔ اس گھر میں اب تمھیں کوئی نہیں جانتا۔ تمہارے پرانے ملازم میں نے ایک ایک کر کے سارے کے سارے نکال دیے ہیں۔ اس گھر کا ہر فرد میرا کُتا ہے۔ جو تمھیں میرے ایک اشارے پر ہی چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔

راجو: میں انسان کی اولاد ہوں۔ کتوں سے نہیں ڈرتا۔

رانی: (تالی بجاتی ہے)

ملازم نمبر۱: آپ نے بلایا مالکن؟

ملازم نمبر۲: آپ نے یاد فرمایا رانی صاحبہ؟

رانی: اس اجنبی نوجوان کے لیے شربت کا گلاس لے آؤ۔ گرمی نے بیچارے کا

سر چکرا دیا ہے۔

ملازم نمبر۱: یہیں حاضر کروں یا اِن کو مہمان خانے میں لے جاؤں۔

راجو: (رانی کو غصے سے گھورتے ہوئے) تمہاری یہ مجال؟

ملازم نمبر۲: یہ گستاخ ہے رانی صاحبہ، حکم ہو تو پیس ذرا ٹھنڈا کر دوں۔

ملازم نمبر۱: اس کی گرمی روح افزا سے نہیں سمندر میں دو چار غوطوں سے اپنے آپ چلی جائے گی۔ Worli Sea Front کوئی ایسا دُور نہیں۔

راجو: ہم اس گھر کے مالک ہیں۔ سیٹھ مایا داس کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ ہم اس مایا نگری کے راجکمار ہیں، ولی عہد۔

ملازم نمبر۲: یہ واقعی بوکھلا گیا ہے رانی ماں۔ چھوٹی سرکار کے ہوتے ہوئے یہ اپنے آپ کو بڑی سرکار کا بیٹا بتلاتا ہے۔ وہ بھی اِکلوتا۔

رانی: کون جانے بیچارہ ٹھیک ہی کہتا ہو۔ تمہاری بڑی سرکار کے اِس عمر میں یہ تیور ہیں جوانی میں تو ظاہر ہے کہ اور بھی رنگین رہے ہوں گے۔ ابھی نہ جانے اِس جتنے کتنے حرامی پلّے اس قسم کے دعوے دار ہوں گے۔ اِس جہاں نگر میں۔

ملازم نمبر۱: پھر تو ماں جی اس کا علاج سمندر کا کھارا پانی ہے، شربت نہیں۔

رانی: تم نے اِسے اِس کا مقام سمجھا دیا ہے۔ اب یہ کوئی گستاخی نہیں کرے گا۔ اب تم دونوں جا سکتے ہو۔ شربت کی بھی اب ضرورت نہیں ہے۔

راجو: تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تم واقعی اس مایا نگر کی ملکہ ہو۔ ابھی ابھی یہ ملازم جس چھوٹی سرکار کا ذکر کر رہا تھا وہ اپنا وِشال ہی ہے نہ۔

رانی: تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔ تمہارا بیٹا جواب تمہارا بھائی ہے۔ اور میں تمہارے بیٹے کی ہی نہیں، تمہاری بھی ماں ہوں۔ ہے نہ عجیب سا رشتہ۔

راجو: میں اس رشتے کو نہ مانوں تو۔

رانی: تو پھر میری اس سلطنت میں تمہیں مناسب مقام تو ایک طرف معمولی سی ملازمت بھی نہیں مل سکتی۔

دروازہ کھلنے کی آواز — سیٹھ مایاداس کا داخلہ

مایاداس: (نشے میں دھت آواز میں) تم کاروبار کے بکھیڑوں میں اتنی الجھی رہتی ہو کہ بیچارے مایاداس کے لیے تمہارے پاس وقت ہی نہیں بچتا۔ آج تم کس نئے چکر میں (راجو کو دیکھ کر) یہ کون ہے؟

راجو: میں آپ کا بیٹا ہوں پتاجی۔ آپ کا راجو۔

مایاداس: یہ بھی خوب رہا۔ ہمارا چار سال کا بیٹا ایکدم اتنا بڑا ہو گیا اور اس نے اپنا نام بھی بدل لیا ہے۔ یہ راجو کیا بلا ہے۔ وِشال بُرا نام تو نہ تھا۔

راجو: (پاؤں کو چھونے کی کوشش کرتا ہے) میں راجو ہوں۔ آپ کا راجندر — راجندر کمار۔

مایاداس: ارے ہٹ پرے بھکاری۔ پاؤں چھونے کی پرانی رسم ہماری بیگم صاحبہ کی مملکت میں اب رائج نہیں۔ کیوں بیگم ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔

راجو: آپ مجھے، اپنے بیٹے کو پہچان نہیں رہے۔

مایاداس: ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔ اور دو بیٹیاں۔

راجو: میں آپ کا بڑا بیٹا ہوں۔ آٹھ سال بعد امریکہ سے لوٹا ہوں۔

مایاداس: بڑے مورکھ ہو امریکہ میں تھے تو واپس کیوں آئے۔ امریکہ سے بے وقوف واپس آتے ہیں۔

راجو: میں تعلیم ختم کر کے اپنے ملک، اپنے گھر اپنے باپ کے پاس آیا ہوں اور آپ یہ ناٹک کیوں کر رہے ہیں۔

مایا داس: یہ جوکر ہمیں کسی ناٹک کا پاتر سمجھتا ہے۔ بڑا گستاخ ہے۔

رانی: یہ راجندر ہے۔ آپ کا بڑا بیٹا۔ یاد کیجیے۔

مایا داس: ہمیں کچھ یاد نہیں اور اپنے بھُولے بھلائے ماضی میں لوٹ جانا اب ہمارے لیے قطعی ممکن نہیں۔ اگر تم اسے جانتی پہچانتی ہو تو کچھ دے دِلا کر رخصت کر دو۔ اب میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔

(لوٹ جاتا ہے)

رانی: (راجو سے مخاطب ہو کر) تم نے دیکھا آج تم بھی اتنے ہی بے بس اور اپاہج ہو جتنی کبھی میں تھی۔

دروازہ پر دستک

وِشال وِیشالی اور چھوٹی نمی۔ ہم اندر آسکتے ہیں ممی جی۔

رانی: ضرور آسکتے ہو، بچو!

(تینوں بچوں کا ایک ساتھ داخلہ)

وِشال: ہمیں بابو جی نے بھیجا ہے۔

ویشالی: جوکر دیکھنے۔

وِشال: آپ ہی وہ جوکر ہیں نہ انکل!

ویشالی: آپ سرکس میں کام کرتے ہیں نا انکل جی!

وِشال: ہم نے آج تک کوئی سرکس نہیں دیکھا۔

رانی: ابھی کل ہی تو ٹی وی پر تم نے روسی سرکس دیکھا تھا۔

وشال: ہم زندہ سرکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیوں ویشالی۔ کیوں نمو۔ ویشالی اور نمو (ایک ساتھ) ہاں بھیّا ہم زندہ سرکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ (پھر راجو کی طرف مڑکر) آپ ہمیں اپنا سرکس دکھائیں گے نا انکل جی!

راجو: وِشال کی طرف دیکھتے ہوئے (حسرت بھرے لہجے میں) میں جوکر ہی ہوں بچو! تمہیں اپنا سرکس ضرور دکھاؤں گا۔

رانی: (بچوں سے مخاطب ہوتے ہوئے) اب تم لوگ جاؤ۔ تم لوگوں کی گورنیس صاحبہ اب آتی ہی ہوں گی۔

ناچتے گاتے، ہنستے، کھیلتے تینوں بچوں کا ایک ساتھ لوٹ جانا

(دروازہ بند کرنے سے پہلے وِشال) بابو جی آپ کو بلا رہے ہیں ممی جی۔

راجو: (آہ بھر کر) کتنے پیارے بچے ہیں۔

رانی: سانچہ خوب صورت ہو تو بچے خوب صورت ہی پیدا ہوتے ہیں۔

راجو: تمہیں اپنی سُندرتا پر بڑا ناز ہے۔

رانی: ناز کیوں نہ ہو۔ میں ہوں ہی سُندر۔

راجو: اتنا غرور اچھا نہیں ہوتا رانو۔

رانی: یہ فلمی مکالمہ ہے۔ تم دیوداس نہ کبھی تھے نہ بن سکتے ہو۔ میرا خاوند مجھے بلا رہا ہے۔ لہٰذا اب تم جاؤ۔ تم چاہو تو اس وسیع و عریض عمارت کے کسی حصہ کو اپنا مسکن بنا سکتے ہو۔ تمہارا یہ حق میں نہ لوں گی۔ تم واپس امریکہ لوٹ جانا چاہو تو اِس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ تم اپنے ہوٹل سے ٹیلی فون کر دینا تمہیں جتنے روپے درکار ہوں گے۔ پہنچا دیے جائیں گے۔

راجو: اچھا رانو۔ تو جو کر رہی ہو آج وہی ٹھیک ہے، تم حقدار ہو۔ میں نے تم سے جو سلوک کیا تھا یا جو سلوک مجھ سے ہو گیا تھا اس کے ردعمل کے طور پر تمہارا یہ رویہ نامناسب نہیں۔ اور ہاں میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ میں نے ایک امریکی لڑکی سے شادی کر لی ہے اور ہم دونوں کچھ دنوں سے تاج میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور جلد ہی ہندوستان کے چیدہ چیدہ مقامات دیکھ کر واپس لوٹ جائیں گے۔ ہمارے پاس ریٹرن ٹکٹ تو ہیں، مگر مقامی کرنسی کافی نہیں۔ ہو سکے تو دس بیس ہزار کی رقم تاج کے کمرہ ۲۷ر میں پہنچا دینا۔

رانی: بیس ہزار آج کل کیا ہوتے ہیں۔ لاکھوں کی بات کرو راجو اور ہاں یہ چند زیور میری بہو کو اس کی ساس کی طرف سے دے دینا (اپنے سارے زیور اُتار کر میز پر رکھ دیتی ہے)

راجو: ارے کیا کر رہی ہو۔ سارے زیور

رانی: یہ میری بہو کے لیے ہیں۔ مجھے اب زیورات کی ضرورت نہیں رہی۔ اپنے یہ قیمتی پارجات بھی اُتار دیتی مگر اپنے جوان بیٹے کے سامنے ایکدم ننگی ہو جانا شاید مناسب نہ ہوگا۔ تم ایک کروڑ پتی باپ کے بیٹے ہو۔ میری بہو کے ساتھ بنیوں جیسا سُلوک نہ کرنا۔ آج شام تک تمہیں ایک نئی کار اور دس لاکھ روپے کی رقم مل جائے گی۔ جب تم یہاں سے گئے تھے تو تمہارا باپ اس سے بڑی رقم کا مالک نہ تھا۔

راجو: میں جا رہا ہوں اور ظاہر ہے کہ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔

رانی: تم نے شادی کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے راجو ورنہ خدا گواہ ہے کہ تم آج تک میرے ضمیر پر ایک بڑا بوجھ بنے بیٹھے تھے۔ اور اپنے بیٹے کو باپ کا نام دلوانے کی خاطر وہ کر ڈالا جو محبت کرنے والے کبھی نہیں کرتے۔ الوداع راجو۔

راجو: الوداع رانو!

(اداس موسیقی ــــ درد بھری دُھن)

موت پر فتح

کردار

ڈاکٹر ینگ	سائنس داں	عمر ۱۷۵ برس
لارڈ گرے	ڈاکٹر ینگ کا جگری دوست	عمر ۱۷۰ برس
مِس ینگ	ڈاکٹر ینگ کی خوب صورت لڑکی	عمر ۱۰۰ برس
مِس ولیم	ڈاکٹر ینگ کی تیز طرار ملازمہ	عمر ۱۳۰ برس
مسٹر لابی	سیاست داں	عمر ۱۷۰ برس
پروفیسر شارپ برین	ماہر ریاضی وفزکس	عمر ۱۷۵ برس
مسز جوشوا	سیر وسیاحت کی دلدادہ ایک امیر زادی	عمر ۱۶۰ برس
مسٹر بینکر بینکر	تاجر	عمر ۱۶۵ برس
مسٹر جولی	ایک خوش فکر نوجوان اخبار نویس	عمر ۱۲۵ برس

از

اِنتساب

انسان کے نام

جس کا مستقبل انتہائی روشن ہے اور انتہائی تاریک بھی

ایکٹ پہلا

زمانہ : آج سے لگ بھگ ایک سو برس بعد یعنی اکیسویں صدی کا وسط
مقام : چاند اور زمین کے درمیان ایک مصنوعی طاس
وقت : نصف شب

ایکٹ دوسرا

زمانہ : وہی
مقام : زمین
وقت : شام (ایک روز بعد)

ایکٹ تیسرا

زمانہ : وہی
مقام : زمین
وقت : شام (اندازاً ایک ماہ بعد)

پیش لفظ

بات 1954 کی ہے جب کہ پہلے پہل میں نے اس ڈارمہ کو لکھنے کا قصد کیا۔ اُس وقت تک نہ تو کوئی 'سپوتنک' چھوڑا گیا تھا اور نہ ہی کوئی انسان خلائی پرواز پر نکلا تھا۔ لیکن اخبارات ورسائل میں خلائی پرواز کے اِمکانات اور دوسرے سیارگان کو سر کرنے کی انسانی کوششوں کے بارے میں برابر چرچا ہوتی رہتی تھی۔ سائنس کی نت نئی اور چکاچوندھ کردینے والی ایجادات کے پیش نظر کوئی بھی بات غیر ممکن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مستقبل میں جب انسان خلائی طیاروں میں دوسرے سیاروں تک اُسی طرح پہنچنے لگے گا جس طرح کہ آج کل لوگ جیٹ جہازوں کے ذریعے نئی دہلی سے لندن، ماسکو یا نیویارک جاتے ہیں، اور سائنس اس قدر ترقی کر چکی ہوگی کہ ناکارہ یا بوسیدہ انسانی اعضا کو اسی طرح تبدیل کیا جاسکے گا جس طرح کہ آج مشینوں کے گھسے ہوئے کل پرزوں کو بدل دیا جاتا ہے، تو اُس وقت انسان کی حرکات وسکنات، عادات وخصائل، جذبات واحساسات کس قسم کے ہوں گے اور ان میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہو چکی ہوں گی؟ بس یہی ایک خیال اس ڈرامہ کی تحریک کا باعث ہوا۔ جلد ہی اسے صفحۂ قرطاس پر اتار لیا گیا۔ لیکن تسلی نہ ہوئی۔ اس میں اور تو بہت کچھ تھا لیکن 'ڈرامہ'' نہیں تھا۔ میری مراد اس کشمکش (Conflict) اور تذبذب (Suspense)

ہے جسے ڈرامہ کی روح کہنا چاہیے۔ لہٰذا اسے سرد خانے میں رکھ دیا گیا حتیٰ کہ یہ طاقِ نسیاں کی زینت بن کر رہ گیا۔

اکتوبر ۱۹۵۷ء میں پہلا مصنوعی سیارہ — روسی سپتونِک — زمین کے گرد چکر لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ خلائی پرواز میں یہ ایک اہم مرحلہ اور ایک عظیم کامیابی تھی۔ اس واقعہ نے ایک بار پھر دل و دماغ کو جھنجوڑا اور طاق نسیاں پر رکھے ہوئے مسودے کی یاد دلا دی۔ مسودہ ڈھونڈا گیا۔ اس پر نظر ڈالتے ہوئے انجانے میں مرزا غالب کا یہ شعر دماغ میں کوند گیا۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

بس ڈرامے کا مرکزی خیال ہاتھ آ گیا تھا۔ اُس کو لے کر نئے سرے سے ڈرامہ لکھنا شروع کیا۔ اور دو تین نشستوں میں ہی مکمل کر ڈالا۔

موت انسان کا سب سے بڑا خوف ہے اور روزِ اوّل ہی سے انسان اس بات کا خواہاں ہے کہ اسے عمر دوام نصیب ہو یعنی اسے موت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ طبی سائنس داں انسانی عمر کو زیادہ سے زیادہ طوالت دینے کے لیے سرگرداں ہے۔ کیا تعجب کہ مستقبل میں انسان ایک ایسے موڑ پر پہنچ جائے جہاں کہ "پائے رفتن نہ جائے ماندن" والا معاملہ بن جائے۔ عمر دوام اس کی دسترس میں ہو اور اس گوہر مقصود کو حاصل کرنے کی زبردست خواہش رکھتے ہوئے بھی وہ اس سے اپنا دامن چھڑانے کی بھرپور کوشش کرے۔ یہ امکانی صورتِ حال ایک عجیب کشمکش اور تذبذب کی حامل ہے۔ ڈرامہ کا تانا بانا اسی انسانی تذبذب یا ذہنی کشمکش کے گرد بُنا گیا ہے اور اسی وجہ سے یہ ادبی کوشش جو ذہنی عیاشی کے طور پر شروع ہوئی تھی، ایک سنجیدہ مقصدی ڈرامہ کی شکل اختیار کر گئی۔ اپنی اس کوشش میں میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں، یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔

اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ایک اچھا ادبی ڈرامہ اسٹیج پر بھی کامیابی سے کھیلا جا سکے، لیکن اگر ڈرامہ لکھتے وقت اسٹیج کی ضروریات کا خیال رکھا جائے تو ایسا کرنے میں بہت زیادہ

دقت پیش نہیں آنی چاہیے۔ میں نے حتی الوسع ان ضروریات کو دھیان میں رکھا ہے لیکن اس کے باوجود بعض لوگ یہ محسوس کریں گے کہ جہاں تک اسٹیج کرنے کا تعلق ہے، موت پر فتح، ایک مشکل ڈرامہ ہے۔ میں ان حضرات سے کسی حد تک متفق بھی ہوں۔ اس کی ایک بڑی وجہ ڈرامہ کا سنجیدہ سائنسی موضوع ہے۔ سیارگان کی تسخیر اور موت پر فتح ایسے تصورات کو اسٹیجی ڈرامہ میں سمونا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تاہم مجھے اطمینان ہے کہ ایسے موضوع کو تین اسٹیج سیٹوں کی قید میں لایا جا سکا ہے۔ ان سیٹوں کی تفصیل ہر ایکٹ کے شروع میں دی گئی ہے۔ یہ سیٹ اگرچہ دقت طلب ہیں تاہم ان میں کوئی ایسی بات نہیں جو اسٹیج پر ڈرامہ کی کامیابی میں سدّ راہ ہو۔ اسٹیج سیٹوں کی تشکیل کے بارے میں جہاں میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ہر قسم کا مشورہ دینے کو تیار ہوں، وہاں میں ان کی رائے سے استفادہ کرنے کا بھی خواہشمند ہوں چنانچہ سیٹوں کی تعداد کم کرنے یا اُن کا تاثر بڑھانے کے اعتبار سے اگر کوئی صاحب مشورہ پیش کریں تو میں انتہائی شکر گزار رہوں گا۔

——جیالال ساز

چندی گڑھ

۲۰/جون ۱۹۶۳ء

پبلشرز نوٹ

جناب جیالال ساز ۳؍فروری ۱۹۲۷ء کے روز باغبان پورہ لاہور (حال پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کیا اور ۱۹۴۹ء میں انگریزی ادبیات میں ایم۔اے۔ اسی سال پنجاب یونیورسٹی سے جرنلزم کا ڈپلوما صوبہ بھر میں اوّل رہ کر پاس کیا۔

تقریباً دو سال دہلی کے اُردو اخبارات سے منسلک رہنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں حکومت پنجاب کے محکمہ تعلقاتِ عامہ میں پہلے آرٹیکل رائٹر اور پھر ایڈیٹر کا عہدہ سنبھالا۔ ۱۹۵۴ء میں 'چندی گڑھ ایڈمنسٹریشن کے اردو ماہنامہ 'پاسبان' کے مدیر اور ۱۹۵۶ء میں اُن کے انگریزی رسالہ ایڈوانس (ADVANCE) کے اڈیٹر بنے۔ ۱۹۶۵ء میں حکومت ہند کے پلاننگ کمیشن کے رسالہ 'یوجنا' پھر منسٹری آف انڈسٹری میں بطورِ ڈائریکٹر پبلشی نمائش اور آخر کار ۱۹۸۵ء میں منسٹری آف ہیلتھ اینڈ فیملی ویلفیئر سے چیف اڈیٹر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔

ناولٹ، کہانیاں، ڈرامے اور مزاحیہ مضامین کے علاوہ بے شمار ریڈیو اور ٹی وی فیچر وغیرہ بھی لکھے۔

۱۹۶۲ء میں حکومتِ پنجاب نے موت پر فتح کو سال کا بہترین ڈرامہ قرار دیتے ہوئے انعام سے نوازا۔ یہ ڈرامہ بعد میں (یعنی ۱۹۶۳ء) میں مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا۔ جناب رفعت سروش کی رہنمائی میں یہ ڈرامہ کئی بار آکاش وانی دہلی سے بھی براڈ کاسٹ ہوا۔

آجکل نان پروفیشنل (Non Professional Pensioner) کی زندگی جی رہے ہیں۔ لکھائی پڑھائی، سیر و سیاحت، فوٹوگرافی اور سنجیدہ گپ بازی کے علاوہ علم و ادب سے اُن کی دلچسپی جو زمانہ طالب علمی ہی سے شروع ہوگئی تھی آج بھی قائم ہے۔

ایکٹ پہلا

(پردہ اُٹھتا ہے)

(ڈاکٹر ینگ کے مکان میں کھانا کھانے اور کام کرنے کا کمرہ۔ کمرے کے ایک طرف ڈاکٹر ینگ کی لائبریری بجی ہے۔ نزدیک ہی میز پر ایک بڑا ریٹارٹ (Retort) فٹ کیا ہوا ہے۔ میز پر متعدد آزمائشی نالیاں (Test Tubes) اسٹینڈ میں رکھی ہیں۔ ان نالیوں میں مختلف رنگوں کے کیمیائی مائع (Chemical liquids) بھرے ہوئے ہیں۔ شیشے کی چھوٹی چھوٹی الماریوں اور برتنوں میں چند زندہ اور چند مُردہ چُوہے اور خرگوش بند ہیں۔ ڈاکٹر ینگ اُن پر تجربہ کرنے میں منہمک ہے۔

سارے کمرے کی آرائش عجیب ڈھنگ کی ہے، تصویریں اُلٹی سیدھی لگی ہوئی ہیں اور ان میں سے کئی تصویریں اور چند دیگر اشیاء ہوا میں معلق معلوم ہوتی ہیں۔

کمرے کے دوسری طرف ایک سہ کونہ ڈائننگ ٹیبل پڑی ہے میز کے اردگرد چند کرسیاں ہیں اور اس کے اوپر مختلف رنگوں کی ٹکیوں سے بھری آٹھ دس خوب صورت شیشیاں اور بوتلیں پڑی ہیں۔ ملازمہ ڈنر ٹیبل لگانے میں مصروف ہے۔

کمرے کے وسط میں مینٹل پیس (Mantle piece) پر ڈاکٹر ینگ کی سو سال پہلے کی ایک بڑی تصویر شیشے میں جڑی ہوئی رکھی ہے جس میں وہ انتہائی معمر دکھائی

دیتا ہے۔ تصویر میں نظر آنے والے ڈاکٹر ینگ کے مقابلے میں موجودہ ڈاکٹر ینگ ایک انتہائی چاق چوبند انسان نظر آتا ہے۔
گھڑیال رات کا ایک بجا رہا ہے۔
ڈاکٹر ینگ سے تھوڑے فاصلے پر لارڈ گرے ایک آرام کرسی پر تشریف فرما ہیں۔
لارڈ گرے ایک سابق جاگیردار اور ڈاکٹر ینگ کا جگری دوست ہے)۔

لارڈ گرے: (ڈاکٹر ینگ کو مخاطب کرتے ہوئے) چھوڑو بھی یار! ڈنر کا وقت ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے آج موت پر فتح پا کر ہی اُٹھو گے۔
(ڈاکٹر ینگ بدستور اپنے تجربے میں منہمک ہے۔ لارڈ گرے کی باتیں ان سُنی ہی رہتی ہیں)۔
......عجیب مصیبت ہے! لوگ تو ڈیڑھ سو سال کی اوسط عُمر سے ہی گھبرا اُٹھے ہیں اور ڈاکٹر ینگ کی تِکا بوٹی کرنے پر آمادہ ہیں اِدھر ڈاکٹر ینگ ہے کہ انہیں عمرِ دوام دینے پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے (ڈاکٹر ینگ کو مخاطب کرتے ہوئے) سُنا بھی ہے لوگ کیا کہتے ہیں تمہارے بارے میں؟

ڈاکٹر ینگ: (چونک کر) کیا کہا؟

لارڈ گرے: گالیاں دے رہے ہیں، گالیاں۔
(ڈاکٹر ینگ مسکرا دیتا ہے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے)۔

لارڈ گرے: عجیب احمق سے واسطہ پڑا ہے۔ ارے میاں! لوگ تو تم پر تین حرف بھیج رہے ہیں اور حکومت سے تمہاری گرفتاری کا مطالبہ کر رہے ہیں اور تم ہو کہ کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

ڈاکٹر ینگ: ناشکرے کہیں کے! کامیاب ہو لینے دو مجھے۔ یہی لوگ خدا بنا کر میری پرستش کریں گے۔
(ڈاکٹر ینگ پھر اپنے تجربے میں مگن ہو جاتا ہے)۔

لارڈ گرے: (ایک ٹھنڈا لمبا سانس بھرتے ہوئے) دنیا بدل گئی لیکن اس مُورکھ کو سمجھ نہ آئی۔ وہ تو اس کی بوٹیاں نوچنے کو بے قرار ہیں اور یہ ہے کہ احمقوں کی جنت بسائے بیٹھا ہے۔

واہ بھئی واہ! محسن ہوتو ایسا ہو(ملازمہ کو مخاطب کرتے ہوئے)مس ولیم! تم ہی کچھ سمجھاؤ اپنے آقا کو۔ آخر، ہر بات کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔

مِس ولیم: بہت خوب! گویا کہ اب وہ میری بات ہی تو مانیں گے۔ کہاں وہ دعویٰ کہ ڈاکٹر صاحب دنیا بھر میں اگر کسی کی بات مانتے ہیں تو لارڈ گرے کی اور کہاں اس بندی سے سفارش کہ وہ ڈاکٹر ینگ کو راہِ راست پر لائے۔ اچھی رہی یہ دل لگی۔

لارڈ گرے: تم نے تو یونہی بال کی کھال اُتارنی شروع کردی۔ تم ہی کہو مس ولیم! کیا تمہیں ڈاکٹر ینگ کے یہ طور طریقے پسند ہیں۔ وہ تو عمرِ دوام کا راز تلاش کرنے کے لئے اپنے آپ کو ہلکان کرلے اور لوگ جن کے لئے یہ سب کچھ کیا جائے، وہ اس کے نام سے ہی بے زار ہوں۔

مِس ولیم: (لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے) بھلا وہ کیوں؟ دنیا تو ڈاکٹر ینگ کو اپنا سب سے بڑا محسن سمجھتی ہے۔

لارڈ گرے: وہ دن گئے جب لوگ اسے اپنا مُحسن سمجھتے تھے، اب تو وہ اس کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ تمہیں شاید اس بات کا عِلم نہیں کہ اس کے خلاف ایک زبردست ایجی ٹیشن اُٹھ کھڑی ہوئی ہے اور حکومت سے اس کے تجربات پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔

مِس ولیم: چھی، چھی۔ آقا جو نیا تجربہ کر رہے ہیں اسے کامیاب ہو لینے دو یہی لوگ ڈاکٹر ینگ کو اپنا معبود نہ بنالیں تو ولیم نام نہیں۔

لارڈ گرے: خدا کے لئے ایسا نہ کہو! اُس کی کامیابی دنیا کے لیے مستقِل عذاب کا باعث ہوگی۔

مِس ولیم: سچ کہتی تھی مِس ینگ۔ آپ واقعی ایک دقیانوسی انسان بن گئے ہیں۔ 'خُدا'۔ 'عذاب' بھلا ان باتوں کا ہمارے زمانے سے کیا تعلق۔ آپ کی اس تبدیلی پر حیرانی ہوتی ہے۔ کہاں آج سے سو برس پہلے کا لارڈ گرے، حُسن، نغمے اور رقص کا قدردان۔ شکار، شعر اور شراب کا دلدادہ، موسیقی، ادب اور سنگ تراشی کا سرپرست۔ سیر و تفریح اور ناٹک کا رسیا۔ اور کہاں آج کا لارڈ گرے۔ زندگی سے بیزار اور پریشان حال۔

لارڈ گرے: آہ کس سنہری زمانے کی یاد دلائی! سچ ہی تو کہتی ہو مس ولیم! زندگی سے بیزاری نہ ہو تو کیا ہو! کمبختوں نے ایک بھی چیز تو صحیح حالت میں نہیں چھوڑی اور تو اور حسن کے لئے بھی اب زُہرہ (Venus) کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ گویا ہماری دنیا کی تمام خوب صورت عورتیں پَر لگا کر اُڑ گئی ہوں: اور پھر حسن کا معیار تو دیکھو مخروطی بیلن کی طرح اوپر سے لے کر نیچے تک گول سپاٹ جسم۔ سر اور ٹانگیں ڈھونڈے سے نہیں ملتیں۔ اللہ اللہ کیا زمانہ آ گیا ہے حُسن ہے کہ روڈ رولر!

مِس ولیم: حسن ہے کہ روڈ رولر۔ چھی، چھی۔ کیا پُرانے زمانے کی تشبیہہ دی ہے۔ یُوں کہو حسن ہے کہ سپیس راکٹ۔ سپیس راکٹ! جناب والا! شاعرانہ مزاج تو آپ کا قائم ہے مگر بوسیدہ خیالی نہیں گئی۔

لارڈ گرے: جا بھی کیسے سکتی ہے۔ بقول شاعر

ع تجھے اُٹھکیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں۔

مِس ولیم: آپ کا قصور نہیں۔ قصور تو ....

لارڈ گرے: (بات کاٹتے ہوئے) ڈاکٹر ینگ اور اس کے بھائی بندوں کا ہے۔

(گھڑیال ڈیڑھ بجا رہا ہے۔ ڈاکٹر ینگ بڑے اطمینان سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹیسٹ ٹیوب اسٹینڈ میں رکھ دیتا ہے۔

کاپی میں کچھ درج کرتا ہے اور خورد بین سے ایک چوہے کا معائنہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔)

ڈاکٹر ینگ: ہُوں۔ درست معلوم ہوتا ہے۔ چند دن اور زندہ رہا تو کامیابی کا زبردست امکان ہے۔

لارڈ گرے: (کرسی سے اچھلتے ہوئے) باپ رے باپ!

(دروازے سے مِس ینگ اندر داخل ہوتی ہے)۔

مِس ینگ: کیا کہا پاپا! کامیابی یقینی ہے۔

ڈاکٹر ینگ: یقینی تو اس وقت ہوگی جب تجربہ پوری طرح کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن یہ چوہا کم از کم پندرہ دن اور زندہ رہا تو امید واثق ہے کہ موت پر فتح پانا کافی آسان ہو جائے گا۔

لارڈ گرے: (ڈاکٹر ینگ کو مخاطب کرتے ہوئے) تمہارے خلاف لوگوں کی جدوجہد کا ساتھ دینا ہی پڑے گا.........

(ڈاکٹر ینگ مسکراتا ہے)۔

.........جانتے ہو؟ تمہارے تجربات کے خلاف آواز بلند کرنے کے لئے کل ایک عوامی جلسہ ہو رہا ہے۔ مجھے بھی تقریر کرنے کی دعوت ملی ہے۔

ڈاکٹر ینگ: (بڑے اطمینان سے) چشمِ ماروشن دلِ ماشاد۔ آپ اپنا فرض بجالائیں، میں اپنا۔

مِس ینگ: (دخل دیتی ہوئی) پاپا، آؤ پہلے ڈنر کر لیں۔ بہت دیر ہو گئی (سب کھانے کی میز کی طرف جاتے ہیں۔ پہلے لارڈ گرے۔ پھر مِس ینگ اور سب سے آخر میں ڈاکٹر ینگ۔ لارڈ گرے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ مِس ینگ مینٹل پیس کے پاس جس پر ڈاکٹر ینگ کی تصویر رکھی ہے رُک جاتی ہے اور ڈاکٹر ینگ کو بھی روک لیتی ہے۔ ملازمہ میز کے پاس بدستور کھڑی ہے)۔

مِس ینگ: (مینٹل پیس پر پڑی ڈاکٹر ینگ کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پاپا! میں نے کتنی بار کہا ہے کہ سو برس پُرانی اس تصویر کو بدل ڈالیں۔ لیکن آپ سُنی اَن سُنی کر دیتے ہیں۔ مجھے یہ تصویر قطعی پسند نہیں۔

ڈاکٹر ینگ: تمہیں پسند نہیں بیٹا! مجھے تو پسند ہے۔ جس وقت تمہاری والدہ مجھ سے جُدا ہوئیں تو اس وقت میری یہی شکل وشباہت تھی۔ (ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے)۔

وہ صورتیں نہ جانے کس دیس بستیاں ہیں۔
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔

مِس ینگ: یہ کیسے ہو سکتا ہے پاپا! ایک طویل مدّت سے تو میں بھی آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ یہی پُر جلال اور پر شکوہ چہرہ۔ یہی آب دار آنکھیں اور یہی بے قرار روح۔ ذرا بھی تو تبدیلی نہیں ہوئی اس عرصے میں۔

ڈاکٹر ینگ: (اپنے خیالوں میں کھویا ہوا) درست ہے بیٹا۔

مِس ینگ: پھر یہ تصویر نہ جانے کس زمانے کی یادگار ہے۔ یہ لمبے لمبے سفید بال ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے برگد کے کسی معمر پیڑ پر مکڑیوں نے جال بُن رکھے ہوں۔ اور بے

رنگ و نور چہرے پر جھریاں یوں لگتی ہیں جیسے کسی بوسیدہ دیوار کی لاتعداد دراڑیں زبانِ حال سے اپنی بے بسی کی داستان کہہ رہی ہوں۔ مجھے تو وحشت ہوتی ہے اس تصویر سے۔

ڈاکٹر ینگ: وحشت ہوتی ہے میری بٹیا کو! سچ کہتی ہے میری بٹیا۔ کبھی کبھی مجھے بھی وحشت ہوتی ہے۔ اِسے دیکھ کر۔ لیکن یہ اس زمانے کی آخری یادگار ہے جو اب لوٹ کر نہ آئے گا۔

مِس ینگ: ضرورت بھی کیا ہے۔ بھلا اس زمانے میں رکھا ہی کیا تھا۔

ڈاکٹر ینگ: (جذبات سے مغلوب ہو کر) تم کیا جانو، میری بٹیا! اس زمانے کی ایک یاد ہی تو اب میری زندگی کا کُل سرمایہ ہے۔

مِس ینگ: پاپا! تم بھی جذبات کی رُو میں بہہ گئے۔

ڈاکٹر ینگ: کیا کروں۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔ تو نے اس شکستہ ساز کو چھیڑ ہی دیا ہے تو لے سُن۔ یہ اس زمانے کی یادگار ہے جب زندگی کے محل میں تو ابھی نو وارد ہی تھی اور تمہاری اماں اُس محل کے دروازے پر کھڑی ہم کو الوداع کہہ رہی تھیں۔ اُس روز اُس کی نم آلودہ آنکھوں میں جو التجا تھی وہ ہر دم مجھے بے قرار رکھتی ہے۔ اور اس کے آخری الفاظ میں جو تڑپ تھی وہ اب تک میرے سینے میں قائم ہے۔

مِس ینگ: (اشکبار آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہوئی) اماں، پیاری اماں! مجھے تیری گود بھی نصیب نہ ہوئی۔ پاپا! کیا تھی میری اماں کی آخری التجا۔ کیا تھے میری اماں کے آخری الفاظ۔

ڈاکٹر ینگ: (غم گین لیکن مطمئن لہجے میں) تیری اماں نے دارِ فانی سے کوچ کرتے وقت حسرت بھری نظر سے تیری طرف دیکھا اور کہا...... (بیک گراؤنڈ میں ٹیپ مشین پر ریکارڈ کی ہوئی آوازیں)۔

عورت: جانِ من! کونسی کوشش ہے جو تم نے مجھے زندہ رکھنے کے لئے نہیں کی۔ لیکن سب بے سُود۔ میں زندہ رہنا چاہتی تھی کہ سدا بہار پھولوں کی طرح تمہارے پیار کی دولت اپنے دامن میں سمیٹتی رہوں لیکن آہ! موت کو یہ بات پسند نہ آئی۔ وہ ہمیشہ میری گھات میں رہی۔ تم نے اُسے جُل دینا چاہا۔ کئی بار کامیاب بھی ہوئے لیکن وہ کامیابی عارضی تھی۔ اب جبکہ موت نے مجھے پا لیا ہے اور تم سے جدا کر کے تاریک

سنسان راستوں پر لے جانے کے لئے میرے سرہانے کھڑی ہے، میں تم سے اپنی آخری خواہش............

مرد : ہاں، ہاں جلدی کہو۔ میں اسے پورا کرنے کی ہرممکن کوشش کروں گا۔

عورت : میں زندہ نہیں رہ سکتی، نہ سہی۔ میری یہ خواہش ہے کہ میری یہ معصوم بچی اور اس جیسے اور بچے سلامت رہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ موت کا منحوس سایہ اُن تک نہ پہنچ سکے۔

(آخری سانسوں اور ہچکیوں کی آواز)

(معمولی وقفہ)

ڈاکٹر ینگ : آہ! تیری اماں چل دی اور مجھے چھوڑ گئی یہاں بھٹکنے کے لئے عمرِ دوام کا راز تلاش کرنے کے لئے۔

(لارڈ گرے مِس ولیم کو اشارہ کرتا ہے۔ مس ولیم اپنے آقا کی طرف جاتی ہے)

مِس ولیم : پریشان نہ ہوں آقا! مرحومہ نے انسانیت پر ایک زبردست احسان کیا۔ آپ کی کوششیں ضرور کامیاب ہوں گی۔ آیئے اب کھانا کھالیجئے۔

(ڈاکٹر ینگ۔ مِس ینگ۔ اور مِس ولیم کھانے کی میز کی طرف جاتے ہیں۔ اوّل الذکر دونوں کُرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ملازمہ پاس کھڑی رہتی ہے۔)

لارڈ گرے: (ڈاکٹر ینگ کو مخاطب کرتے ہوئے) ماضی کی یاد سچ مچ بڑی تلخ ہے۔ کس قدر غمگین نظر آتے ہو!

ڈاکٹر ینگ: (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) نہیں نہیں کوئی بات نہیں وہ تو یُونہی اس کی (مس ینگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اماں کی یاد آ گئی تھی۔

لارڈ گرے: درست ہے۔ مرحُومہ کی ذات اتنے اوصاف کی حامل تھی کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

مِس ینگ: آہ میں کتنی بدقسمت ہوں۔ اماں کی شکل دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی۔

مِس ولیم: (ڈاکٹر ینگ کو مخاطب کرتے ہوئے) آقا! گستاخی معاف! سارا ماحول افسُردہ ہو گیا ہے۔ کھانے کا خاک مزا آئے گا۔ اگر اجازت ہو تو سب سے پہلے ثمرِ

فرحت بخش پیش کروں۔

سب بیک آواز: ضرور، ضرور۔

(ملازمہ ایک شیشی سے رنگ برنگی ٹکیاں نکال کر سب کی پلیٹوں میں ایک ایک ٹکیا رکھ دیتی ہے۔ سب ایک ساتھ ٹکیاں نگل جاتے ہیں اور مُسکرانے لگتے ہیں۔)

.... ہا ہا ہا۔

ڈاکٹر ینگ: کیا غضب کا پھل ہے۔ کھاتے ہی غم دُور اور بھوک تیز (ملازمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) لاؤ بھئی کھانا۔ اب دیر کس بات کی ہے آنتیں قل ھواللہ پڑھ رہی ہیں۔

(ملازمہ ایک دوسری شیشی سے دو دو ٹکیاں نکال کر سب کی پلیٹوں میں ڈال دیتی ہے۔

مِس ینگ: آہا۔ کیا مزے دار چکن سوپ ہے۔

ڈاکٹر ینگ: چٹخارہ لیتے ہوئے) واقعی۔

مِس ولیم: (ایک دوسری شیشی سے گولیاں انڈیلتے ہوئے) اور زہرہ (Venus) سے جو شامی کباب آئے ہیں، ان کے تیور بھی ملاحظہ ہوں۔

لارڈ گرے: رہنے دو۔ مِس ولیم! کیوں زخموں پر نمک چھڑکتی ہو۔ چکن سوپ شامی کباب۔ بریانی (چٹخارہ لینے کی نقل میں زبان ہلاتے ہوئے) یہ تو سب قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ مذاق کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ لیجئے اب چوزے اور دُنبے بھی ٹکیوں میں بند ہو گئے۔

ڈاکٹر ینگ: ابھی تو ٹکیوں میں ہی بند ہوئے ہیں۔ کل کوزے میں سے اُگنے لگیں گے۔ اُگنے۔

لارڈ گرے: لاحول ولاقوۃ۔

مِس ینگ: (تجسس بھری نظروں سے) تو پاپا ڈاکٹر سنڈے کا تجربہ کامیاب ہو گیا۔

ڈاکٹر ینگ: آج شام ہی مریخ (Mars) سے ڈاکٹر موصوف نے پیغام بھجوایا ہے کہ کامیابی دُور کی بات نہیں۔

لارڈ گرے: بڑی منحوس خبر ہے۔

ڈاکٹر ینگ: تمہاری وہی مُرغے کی ایک ٹانگ والی رٹ۔

لارڈ گرے: ارے میاں! مُرغ ارہانہ ٹانگ۔ اب رٹ بھی کتنی دیر تک چلے گی۔

مِس ینگ: (لارڈ گرے کو مخاطب کرتے ہوئے) آپ کن فضول باتوں میں اُلجھ گئے۔ میں آپ کو ایک ضروری دعوت دینا تو بھول ہی گئی۔ کل شام کو زُہرہ (Venus) میں ایک جدید ترین رقص ہو رہا ہے میرا مطلب ہے وہ رقص جس میں لوگ پیروں کی بجائے سر کے بل ناچتے ہیں۔ چاند سے بھی ایک پارٹی آ رہی ہے۔ میں اس رقص کی کنویز ہوں۔ پاپا کو تو اپنے تجربات سے ہی فرصت نہیں، آپ ضرور تشریف لائیے گا۔

لارڈ گرے: دعوت کا شکریہ، مِس ینگ۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں مجھے کل ایک عوامی جلسے میں تقریر کرنا ہے۔ منتظمان کے اصرار پر وعدہ دے چُکا ہُوں۔ ورنہ تم جانتی ہو میں سَر کے بل آتا۔

ڈاکٹر ینگ: سارا راستہ رقص کرتے ہوئے۔

(سب مُسکراتے ہیں)

مِس ینگ: پروگرام بڑا دلچسپ ہوگا لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ آپ اپنی مصروفیت منسوخ کریں.........خیر.........

لارڈ گرے: مجھے خود بڑا افسوس ہے، مِس ینگ (گھڑیال کی طرف دیکھتے ہوئے) اب مجھے چلنا چاہیے۔

اچھا خدا حافظ

ڈاکٹر ینگ اور مِس ینگ: خُدا حافظ۔

(پردہ گرتا ہے)

●●●

ایکٹ دوسرا

(پردہ اُٹھتا ہے)

(ایک پبلک ہال۔ درمیان میں اسٹیج ہے۔ اسٹیج کے سامنے تیس کرسیاں پڑی ہیں جن پر حاضرین بیٹھے ہیں۔ سٹیج کے دائیں بائیں تین تین چار چار اور کرسیاں پڑی ہیں جن پر مقرر حضرات تشریف فرما ہیں۔ مقررین پروفیسر شارپ برین۔ مسز جو شوا، لارڈ گرے۔ مسٹر بینکر بینکر اور مسٹر جولی شامل ہیں۔ مسٹر لابی صدارتی کرسی پر رونق افروز ہیں[1]۔)

مسٹر لابی: (حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے) خواتین و حضرات! آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہم کس اہم اور نازک مسئلے پر غور کرنے کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس مسئلے کا جو ہمارے دماغوں اور ہماری روح پر ایک بوجھ سا بنا ہوا ہے، ہمارے حال اور مستقبل سے گہرا تعلق ہے۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ گزشتہ ایک صدی میں انسان نے کتنی ترقی کی۔ سپیس میں اُڑنے والے جہازوں کی بدولت انسان چند گھنٹوں ہی میں چاند، مریخ، مشتری وغیرہ سیاروں تک پہنچ سکتا ہے۔ جنگ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ امراض قصہ

1۔ ڈراما کھیلتے وقت ناظرین کو جلسہ گاہ کے حاضرین تصور کیا جاسکتا ہے۔ حاضرین کا ردِّ عمل ظاہر کرنے کے لئے مقررین کو کرسیوں کے آس پاس چند اور کرسیاں لگائی جاسکتی ہیں۔

پارینہ بن گئے۔ اور انسان کی اوسط عمر ڈیڑھ سو سال تک پہنچ گئی۔ دوستو! عمر کا بڑھنا آپ سب کو مبارک ہو۔ لیکن مجھے معاف فرمائیں کہ میں آپ کی توجہ ایک تلخ حقیقت کی طرف دلا رہا ہوں۔ انسانی آبادی میں بے حساب اضافے کی وجہ سے ہمارے سامنے ایک نیا مسئلہ آن کھڑا ہوا ہے۔ کھانے کا مسئلہ نہیں، سمانے کا مسئلہ۔ انسان کی اوسط عمر اور اس کے ساتھ ہی آبادی میں اضافہ اسی رفتار سے جاری رہا تو کچھ عرصے بعد ہی، اس زمین پر تو کیا دوسرے سیاروں پر بھی جہاں جہاں کہ انسان آباد ہو سکتا ہے، تل دھرنے کو جگہ نہ ملے گی اور انسان شاید آپس میں ٹکرا ٹکرا کر فنا ہو جائیں۔

معزز حاضرین! ایک طرف تو یہ خطرہ اور دوسری طرف ڈاکٹر ینگ کے یہ تجربے کہ انسان کو عمر دوام نصیب ہو۔ آج ہم انہی دو خطروں پر جو درحقیقت ایک ہی مسئلے کے دو مختلف پہلو ہیں، غور کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ہم اِس مسئلے کا حل ڈھونڈ کر ہی اُٹھیں گے۔ اب میں آپ کا زیادہ وقت نہ لیتے ہوئے پروفیسر شارپ برین سے جو ریاضی و فزکس کے ایک مانے ہوئے عالم اور جنہوں نے پورے ۷۵ برس ہندسوں کی ہمراہی میں بسر کئے ہیں، درخواست کروں گا کہ وہ اس مئلے پر اظہار خیال فرمائیں۔

(تالیاں)

پروفیسر شارپ برین:

دوستو! آپ جانتے ہیں کہ مجھے آج کل بالکل فُرصت نہیں۔ اگر مسئلہ واقعی اتنا نازک نہ ہوتا جتنا کہ ابھی ابھی صاحبِ صدر مسٹر لابی نے بیان کیا ہے تو شاید میں اس اجلاس میں شریک نہ ہوتا۔ ریاضی کے قدردانو! میں ٹھہرا حساب داں۔ مجھے تقریر کرنا نہ آتا ہے، نہ آئے گا۔ یہ تو مسٹر لابی جیسے سیاست داں کا کام ہے، جس نے پورے ایک سو ستر برس۔ پانچ ماہ نو دن تک اس دشت کی خاک چھانی ہے۔ میں تو سیدھی سادی حساب کی بات جانتا ہوں اور وہ یہ کہ آج سے سو برس پیشتر انسانی آبادی صرف تین ارب تھی۔ لیکن اب یہ آبادی پندرہ ارب تک پہنچ چکی ہے۔

مستقبل میں اگر موت پر مکمل فتح نہ بھی پائی جا سکی، تو بھی انسان کی اوسط عمر میں روز بروز سالہا سال کا جو اضافہ ہو رہا ہے، اس کے پیشِ نظر آئندہ دس برس میں انسانی آبادی دوگنی یعنی تیس ارب اور آئندہ پچاس برسوں میں ایک ہزار گنا یعنی تین سو کھرب ہو جائے گی۔ اس بات کا آپ تصوّر بھی نہیں کر سکتے کیونکہ اس وقت تک دنیا میں صرف ۵۰ کھرب اشخاص کے لئے جگہ بنائی جا سکے گی۔ اور اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ مزید ۱۰۰ کھرب انسان دوسرے سیّاروں میں کھپائے جا سکیں گے تو بھی دنیا میں انسانوں کی تین تہیں یا تین منزلیں کھڑی ہو جائیں گی۔ انسان کے اوپر انسان .... انسان کے اوپر انسان .... تین منزلوں کا تصوّر بھی بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے اور جسم میں کپکپی کر دیتا ہے لیکن دوستو! ریاضی کی رو سے یہ بات ہے سولہ آنے درست۔ انسان کو حرکت تو کیا سانس لینے کے لئے بھی جگہ نہیں ملے گی۔ میں نے آپ کے سامنے حقیقت بیان کر دی۔ اب اس کا حل نکالنا آپ کا کام ہے۔

(حاضرین کے متوحش چہرے اور سہمی سہمی کانا پھُوسی ان کی تشویش کی غمازی کرتے ہیں)

مِسٹر لالی: خواتین حضرات! اب میں آپ کا مسز جوشوا سے تعارف کراتا ہوں جو ابھی زُہرہ (Venus) سے اپنا پچاسواں ہنی مون منا کر لوٹی ہیں۔ مسز جوشوا ہمارے زمانے کی سب سے زیادہ سفر گزیدہ ہستی ہیں جنہوں نے تقریباً تمام سیارگان کی سیاحت کی ہے اب میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے وسیع مُشاہدات کی بنا پر موجودہ مسئلے کا حل ڈھونڈنے میں ہماری مدد کریں۔

(تالیاں)

مِسز جوشوا: لیڈیز اینڈ جنٹلمین! صاحبِ صدر نے آپ کے رُوبرو میری جو تعریف کی ہے، اسے مکمل کرنے کے لئے میں صرف اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں کہ ہنی مُون منانا اور سیر و سیاحت، ان کے سوائے نہ میرا کوئی کام ہے نہ مشغلہ۔ اس سلسلے میں میں نے نہ صرف اس دنیا کے گوشے گوشے بلکہ مریخ۔ مشتری، چاند تک کی خاک بھی چھان ماری ہے۔ زمین کے کئی حصّوں میں میں نے انسانوں کو اس طرح رینگتے دیکھا جس طرح آج سے چند برس پہلے آپ کیڑوں مکوڑوں کو دیکھا کرتے تھے۔ ایک جگہ میں

یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ پورے کا پورا سمندر خشک کر کے وہاں انسان بس گئے جنگلوں کا صفایا کر دیا گیا۔ یہ تو اس دنیا کا حال ہے۔ دوسری طرف چاند وغیرہ سیاروں پر جہاں جہاں لوگ آبادکاری کے لئے گئے ہیں، میں نے سخت بے چینی دیکھی ایک تو ان سیاروں پر قابلِ رہائش جگہ بہت تھوڑی ہے۔ دوسرے وہاں انسان کو بھاری مشکلات اور مصائب کا سامنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مشتری اور مریخ کے باشندے ہم سے شکست کھانے کے باوجود کس قدر سخت جان واقع ہوئے ہیں۔ لہٰذا انہیں بالکل ختم کرنا ممکن نہیں۔ لیکن اگر اس مہم میں کامیابی حاصل ہو بھی جائے تو بھی جیسا کہ پروفیسر شارپ برین نے فرمایا، وہاں ۱۰۰ کھرب انسانوں سے زیادہ کے لئے گنجائش نہ ہو سکے گی۔ لیکن آبادی کس حساب سے بڑھ رہی ہے اس کا آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ مشتری پر حالیہ ہنی مُون کے دوران، مجھے کم از کم دس ہزار رشتے دار اور دوست احباب ملے سب کو یہی شکایت تھی کہ میں نے انہیں اپنی شادی کی تازہ ترین تقریب پر مدعو نہیں کیا۔ اب پروفیسر شارپ برین ہی اندازہ لگا سکیں گے کہ ۵۰ برس بعد میرے دوستوں اور رشتہ داروں کی تعداد کتنی ہو جائے گی اور انہیں اپنی شادی کی تقاریب پر بلانے کے لئے مجھے کتنے ارب یا کھرب دعوتی پیغامات بھیجنے پڑیں گے۔

(حاضرین ہنستے ہیں)

لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میں قطعی اس نتیجے پر پہنچتی ہوں کہ اگر ڈاکٹر ینگ کے تجربات پر فوری طور سے پابندی عائد نہ کی گئی تو نتائج نہایت خطرناک ہوں گے۔ میرے خیال میں ہمیں حکومت کو مجبور کر دینا ہوگا کہ وہ ڈاکٹر ینگ کو گرفتار کرے۔

ایک آواز: ڈاکٹر ینگ کو گرفتار کرو۔

دوسری آواز: ڈاکٹر ینگ مردہ باد

سب آوازیں: ہماری مانگ پوری کرو۔ ڈاکٹر ینگ کو گرفتار کرو۔

مسٹر لابی: خاموش! حضرات! خاموش رہئے۔ اب لارڈ گرے جو گزشتہ ڈیڑھ صدی سے ڈاکٹر ینگ سے دوستی کا حق نبھا رہے ہیں، آپ کو اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں گے۔

لارڈ گرے: دوستو! سب سے پہلے میں آپ سے اس بات کے لئے معافی کا خواستگار ہوں کہ میں آپ کی بہت سی باتوں سے متفق نہیں۔ اگر چہ آپ کی طرح میری بھی یہی خواہش ہے کہ انسان کو عمرِ دوام کا راز معلوم نہ ہو۔ لیکن میرا اندازِ فکر آپ سے یکسر مختلف ہے۔ یہ عجیب زمانہ ہے جس میں انسان اور مشین میں کوئی امتیاز نہیں رہا۔ کہاں وہ زمانہ کہ رات کو بڑے اطمینان سے دس دس۔ بارہ بارہ گھنٹے سوتے تھے۔ دن میں چار چار پانچ پانچ گھنٹے کھانے سے لطف اندوز ہونے میں گزار دیتے تھے۔ دوپہر کو گھنٹوں قیلولہ کرتے تھے۔ لیکن اب نصف گھنٹے سے زیادہ آنکھ جھپکنا ممکن نہیں۔ پندرہ منٹ کھانے میں بیت گئے اور پندرہ منٹ باقی متفرق کاموں میں۔ باقی ۲۳ گھنٹے گھر بیٹھے مکھیاں مارتے ہو۔ معاف کیجئے اب مکھیاں بھی مارنے کو کسے ملتی ہیں۔ گزشتہ ماہ ایک مرتبہ مریخ سے ہو آیا ہوں۔ اب آپ ہی بتایئے خالی وہاں آنے جانے میں کیا لطف ہے۔ دل بہلاوے کی چیزیں تو پرانے زمانے کے ساتھ ہی ختم ہوئیں۔ حُسن ہے تو اس میں دل کشی اور رعنائی نہیں۔ شراب ہے تو اس میں مدہوشی نہیں بھلا واڈ کا اور سیاہ و سفید وِسکی کا مقابلہ آپ کی کون سی شراب کرے گی؟ شکار تھا سو وہ بھی ختم ہوا۔ جب انسان کے اپنے بسنے کے لئے جگہ نہیں تو وہ دوسروں کو کیوں زندہ رہنے دے گا۔ شکار کے ساتھ پالتو جانور بھی گئے۔ آہ! کیا طرح دار تھی میری سپینیل (Spaniel) .... خُدا اُسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ...... (آنسو پونچھتے ہوئے) ادب ہے تو ہماری سمجھ سے بالاتر کہانیاں اور نظمیں ہیں کہ ریاضی کے فارمولے، اب آپ ہی بتایئے کہ میرے جیسے شخص کو پناہ ملے تو کہاں۔

دوستو! آپ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر ینگ میرا جگری دوست ہے اور اگر اسے میرے سفلہ پن پر محمول نہ کیا جائے تو میں عرض کروں کہ اس کی کامیابی میں اس خاکسار کا بھی کچھ ہاتھ ہے جس طرح بھی بن پڑا میں نے اس کی ہر ممکن امداد کی۔ یہ میرا دوستانہ فرض تھا، اس پر کوئی احسان نہ تھا۔ لیکن اب مجھے ڈاکٹر ینگ سے اصولی اختلاف ہو گیا ہے۔ میں ابھی ابھی اس مصنوعی طاس سے آرہا ہوں جو ڈاکٹر ینگ

نے زمین اور چاند کے درمیان قائم کر رکھا ہے۔ اپنے تجربات کے لئے۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹھہرا اپنی دُھن کا پکا۔ مگر دوستو! میں بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قطع نظر دوستی کے، اس معاملے میں میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کی طرح میرا بھی یہ مطالبہ ہے کہ ڈاکٹر رینگ کے تجربات پر پابندی لگا دی جائے۔ بطور دوست میں ڈاکٹر موصوف کی گرفتاری کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کے غیظ و غضب سے بچانے کے لئے حکومت اُسے اپنی حفاظت میں لے لے اور انسانیت کے لئے اس کی گزشتہ خدمات کی بنا پر اُسے ہر قسم کا آرام و آسائش مہیا کرے۔

ایک آواز: دیکھا میں نہ کہتا تھا، ڈاکٹر رینگ کے اپنے جگری دوست بھی اس سے بدظن ہو چکے ہیں۔

دوسری آواز: ہاں بھئی۔ بات ہے ہی کچھ ایسی۔

مِسٹر لابی: حاضرین! اب آپ کے سامنے مشہور و معروف تاجر مسٹر بینکر بینکر جو مریخ میں بینکنگ کا اور مُشتری میں بینکنگ کا کاروبار کرتے ہیں، تقریر فرمائیں گے۔

مِسٹر بینکر بینکر: دوستو! سب سے پہلے میں صاحبِ صدر کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اس اجلاس کو جس میں بڑے بڑے ماہرینِ علم اور نامور مقرر تشریف فرما ہیں، مخاطب کرنے کا شرف بخشا ہے۔ یہ میری ذرّہ نوازی اور آپ کی عزت افزائی ہے...... نہیں نہیں معاف کیجئے یہ ان کی ذرّہ نوازی اور میری عزّت افزائی ہے کہ

(حاضرین لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں)

.... مجھے آپ کو محظوظ کرنے .... میرا مطلب ہے مخاطب کرنے کا نادر موقع دیا ہے۔

(لوگ ہنستے ہیں)

معزز حاضرین! آپ بے شک میری بات ہنسی میں اُڑا دیں لیکن میں اس مسئلہ کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھتا ہوں۔ اپنے کاروبار کے سلسلے میں مجھے اکثر دوسرے سیاروں کو جانا پڑتا ہے اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اتنی ترقی کرنے کے باوجود ہمارے معاشرے میں مرد کو بیک

وقت ایک سے زیادہ شادی کرنے کی ممانعت ہے۔ میں نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے چاند، مشتری، مریخ غرض یہ کہ ہر سیّارے میں جہاں جہاں میرے کاروبار کی شاخیں قائم ہیں ایک ایک خانگی شاخ بھی قائم کردی۔ اس طرح جہاں کاروبار کو فروغ ملتا ہے، وہاں اجنبی علاقے میں انسان کو گھر کی یاد بھی نہیں ستاتی۔

(حاضرین ہنستے ہیں)

دوستو! آج سے چند برس پیشتر مجھے بھی ہنسی آتی تھی اور اپنی اس اُپج پر فخر محسوس کرتا تھا۔ لیکن آج مجھے ایک زبردست فکر دامن گیر ہے۔ آپ شاید یقین نہ کریں کہ اس وقت میرے لڑکے۔ لڑکیوں اور آگے ان کی اولادوں کی تعداد ۱۵ ہزار سے تجاوز کر چکی ہے اور نہیں معلوم کہ یہ تعداد کہاں تک پہنچے۔ ماشاءاللہ ابھی میری (مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا) عمر ہی کیا ہے۔ صرف ۱۶۵ برس...... خیر ان نجی باتوں میں الجھنے سے کیا فائدہ۔

(مسٹر بینکر بینکر کی آواز لوگوں کی ہنسی میں دب جاتی ہے۔)

دوستو! میری رائے میں مسئلے کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے ڈاکٹر ینگ کو اس کے تجربات سے باز رکھنا اور اگر وہ نہ مانے تو حکومت سے مطالبہ کر کے اسے گرفتار کرانا۔ ہاں اگر آپ چاہیں تو میں اُسے زُحل (Saturn) میں جہاں کی آب و ہوا کسی انسان کو موافق نہیں، اپنے کاروبار کا مختار کل بنا کر بھیج سکتا ہوں۔

متعدد آوازیں: ڈاکٹر ینگ مردہ باد۔ ڈاکٹر ینگ کو گرفتار کرو۔

(مسٹر لابی اور مسٹر جولی کے درمیان کانا پھوسی)

مِسٹر لابی: خواتین و حضرات! مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے بڑی مسرّت ہے کہ ہمارے جواں سال اور خوش فکر جرنلسٹ مسٹر جولی، میری درخواست پر، اس اجلاس کو مخاطب کرنے اور آج کا ریزولیوشن پیش کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ اب میں مسٹر جولی سے درخواست کروں گا کہ وہ تشریف لائیں۔

(تالیاں)

مِسٹر جولی: صاحب صدر اور حاضرین جلسہ! میں یہاں آیا تو تھا اس تاریخی اجلاس کی رپورٹ

لینے۔لیکن مسئلے کی نزاکت کے پیشِ نظر میرے لئے صاحب صدر کا حکم ٹالنا ممکن نہیں۔

دوستو! سائنس کی ایجادوں کا بھلا ہم اخبار نویسوں سے زیادہ کون مداح ہوگا۔اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں ہمیں دن میں دس دس بار کبھی چاند پر کبھی مشتری پر اور کبھی مریخ پر بڑی بڑی دعوتوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ اس صورت میں معدے کا دیوالہ پٹنا تو قدرتی بات ہے ہی۔یہی وجہ تھی کہ پرانے زمانے کے اخبار نویسوں کا ہاضمہ اکثر خراب رہتا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ ہاضمہ خراب ہو تو انسان چڑ چڑا بن جاتا ہے اور بات بات پر لڑنے مرنے کو تیار رہتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پُرانے زمانے کے اخبار نویس پگڑیاں اچھالنے میں اس قدر ماہر تھے۔اس وقت یہ مشغلہ ان کا ہاضمہ درست کرنے کے لئے چورن کا کام دیتا تھا لیکن بھلا ہو سائنس کا۔انسان کہاں سے کہاں جا پہنچا۔کھانا ہضم کرنے کے لئے معدے میں مشینیں فِٹ ہو چکی ہیں ہاضمے کی خرابی کا امکان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے اور اس کا نتیجہ آپ سب کے سامنے ہے کہ آج میں بھی آپ جیسے عام لوگوں کا ساتھ دینے میں خوشی محسوس کرتا ہوں حالانکہ اصولی طور پر آپ سے سولہ آنے متفق نہیں اور موجودہ ایجی ٹیشن کے بارے میں بھی میری الگ انفرادی رائے ہے۔

حاضرین! پیشتر اس کے کہ میں کچھ اور کہوں میں قدیم اور جدید زمانے کا موازنہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔لارڈ گرے سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔وہ ٹھہرے قدیم زمانے کے بزرگ۔لیکن میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ آج سے سو برس پہلے کا زمانہ تاریکی اور جہالت کا زمانہ تھا۔لوگ غیر مہذب اور دقیانوسی تھے اور اخلاق تو انہیں چھو تک نہ گیا تھا۔نو نو۔دس دس گھنٹے کی نیند۔سیر،عبادت،دُعا،سچائی کی تلاش،شعر و ادب سے لگاؤ۔ یہ سب باتیں زمانۂ جہالت میں ہی ممکن ہو سکتی تھیں۔ ہمارے ترقی پسند زمانے میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں (میز پر زور زور سے ہاتھ مارتا ہے)

(چند آوازیں:ہیئر ہیئر)

............میں تو کہوں گا ادبی اور ثقافتی میدان میں گزشتہ صدی کی نمایاں ترین ترقی

ہے تو یہی کہ لوگوں نے ناول ڈراما۔ شعروشاعری وغیرہ بے کار اصناف ادب کو تلانجلی دے کر اخباری ادب کو دل و جان سے اپنالیا ہے، اور اس بارے میں جو ترقی ہوئی ہے، اس پر انسان عش عش کر اٹھتا ہے۔ ایک صدی پہلے کے اخبار دیکھیں تو آپ پر واضح ہو زمانہ جہالت کے اخبار نویسوں کی بدذوقی۔ شروع سے لے کر آخر تک خبروں اور مضامین سے پُر۔ کہیں کونے میں دو ایک اشتہار بھی دے دیئے۔ اور بس۔ اب آپ ہی دیکھئے کہ یہ مشتہرین سے کس قدر بے انصافی تھی کہ زر کثیر خرچ کر کے بھی لوگوں کے دل و دماغ پر نہیں چھا سکتے تھے۔ لیکن آج زمانہ بدل چکا ہے۔ ہم سوائے اشتہاروں کے اخبار میں کچھ نہیں شائع کرتے۔ مثال کے طور پر آپ کے اس اجلاس کی کارروائی بھی بہ طور اشتہار شائع ہوگی تاکہ لوگ اسے پوری توجہ سے پڑھیں۔ یہ تکنیک بالکل جدید اور ترقی پسندانہ ہے۔ لیکن قدیم لوگ.......... کہاں تک ان کی جہالت کا ماتم کروں۔

دوستو! ہمیں افسوس ہے تو اسی بات کا کہ دُنیا اور معاملوں میں تو ترقی کر گئی لیکن موت کے معاملے میں روز بروز تنزل کی طرف جا رہی ہے۔ لے دے کر اخبار کا دھندا اسی ایک بات پر قائم ہے۔ ہمارے لئے واقعی بڑا نازک وقت آ گیا ہے۔ جنگ و جدال کا کب سے خاتمہ ہو چکا۔ حادثوں کی گنتی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب نہ زلزلے آتے ہیں، نہ طوفان اور خودکشی کا تو کوئی نام ہی نہیں لیتا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اخبار لوگوں کی دلچسپی کا سامان میسّر کریں تو کیوں کر؟ ڈاکٹرینگ کی کامیابی سے اور کسی کو نقصان ہو یا نہ ہو۔ لیکن اخبار نویسوں کی روزی تو لازمی طور پر ختم ہو جائے گی۔ اس لئے دوستو! ڈاکٹرینگ کے تجربات رُکوانے اور ان کی گرفتاری کے لئے اخبارات میں ایک زبردست تحریک شروع کرنے کے لئے میں اپنی برادری کی طرف سے آپ کو پورے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

(تالیاں)

صاحبِ صدر و حاضرینِ جلسہ! اب میں آپ کے سامنے وہ ریزولیشن پیش کرتا ہوں جسے میں نے ایک منٹ کے طویل غور و فکر کے بعد تیار کیا ہے لہٰذا اس پر آپ کو

ذرا بھی سوچنے کی ضرورت نہیں (زیرِ لب مسکراتا ہے)

ریزولیوشن کا مضمون یہ ہے:

''دُنیا بھر کے مختلف شُعبہ جات کے ماہرین اور عوام کے نمائندے اس بات پر متفق ہیں کہ زندگی کے لئے موت بڑی ضروری ہے۔ اس کے لئے وہ حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ

(۱) ڈاکٹر رینگ موت پر قابو پانے کے لئے جو تجربات کر رہا ہے ان پر فوری پابندی لگائی جائے۔

(۲) ڈاکٹر مذکور کو اندیشہ نقصِ امن میں گرفتار کر لیا جائے اور

(۳) اُسے زحل میں جلاوطن کر دیا جائے۔''

میری صاحبِ صدر سے استدعا ہے کہ وہ اس ریزولیوشن پر رائے شماری کرائیں۔

مِسٹر لابی: خواتین و حضرات! چونکہ آپ سب اس ریزولیوشن کے حق میں ہیں، اس لئے آپ اپنے ہاتھ بلا تامل کھڑے کر دیں تا کہ رائے عامہ کے بارے میں کوئی شک نہ رہے۔

(تمام حاضرین ہاتھ کھڑے کر دیتے ہیں)

...........تو گویا آپ سب متفقہ طور پر اس کے حق میں ہیں۔ میں آج ہی آپ کے مطالبات کا چارٹر لے کر ناظمِ اعلیٰ سے ملاقات کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ حکومت کو رائے عامہ کا احترام کرنا ہی پڑے گا۔

آوازیں:

مسٹر لابی زندہ باد۔ ڈاکٹر رینگ مُردہ باد۔ مسٹر لابی زندہ باد۔ ڈاکٹر رینگ مُردہ باد۔

(لوگ ہال سے باہر نکلتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

●●●

ایکٹ تیسرا
(پردہ اُٹھتا ہے)

(ٹاؤن ہال کا کشادہ میدان پس منظر میں گھنٹہ گھر کی اونچی عمارت ہے۔ پیش منظر میں ایک مستقل ڈائس ہے۔ چند اشخاص میدان میں گھوم پھر رہے ہیں)

ایک اخبار بیچنے والے لڑکے کی آواز: موت پر قابو پا لیا گیا۔ ڈاکٹر ینگ کا کامیاب تجربہ۔ آج کا تازہ ضمیمہ۔

ایک دوسرے ہاکر کی آواز: انسان ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ڈاکٹر ینگ کا خُدائی دعویٰ۔ تازہ پرچہ۔

(لوگ آواز سُن کر چونک اُٹھتے ہیں۔ رُک جاتے ہیں۔ پھر ایک دم اخبار خریدنے لگتے ہیں)

ایک: اِدھر دینا۔

دوسرا: ایک اِدھر بھی۔

تیسرا: پہلے مجھے۔

چوتھا: باری میری ہے۔

(اخبار ہاتھوں ہاتھ بِک جاتے ہیں۔ دور رہگیروں کی باتیں کرنے کی آواز۔)

پہلا: اب کیا ہوگا؟

دوسرا: جینا ہوگا۔ انسان خدا بن گیا۔

پہلا: نہیں، نہیں! ایسی کُفر کی باتیں مُنہ سے مت نکالو۔ انسان خُدا نہیں بن سکتا۔

دوسرا: ارے میاں! کس زمانے کی باتیں کرتے ہو۔ تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوتا

ہے۔ ڈاکٹر ینگ خدا نہیں تو کیا ہے؟

پہلا: انسانیت کا گنہگار۔ انسان کے مستقبل عذاب کا ذمہ دار اگر حکومت عوامی مطالبہ پر کان دھرتی تو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

(معمولی وقفہ)

ہاکر کی آواز: آج کا تازہ ترین پرچہ۔ ڈاکٹر ینگ کو گرفتار کر لیا گیا۔ ڈاکٹر ینگ کو پانچ بجے شام ٹاؤن ہال کے میدان میں عوامی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

(لوگ ٹاؤن ہال کے میدان میں اُمڈ پڑتے ہیں۔ پسِ پردہ گاڑیوں اور موٹروں کا شور دھکم پیل میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، دیکھتے ہی دیکھتے میدان جلسہ گاہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ شہر کے ناظم اعلیٰ باڈی گارڈ کی حفاظت میں تشریف لاتے ہیں اور صدارتی کرسی پر رونق افروز ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ینگ کو مسلح سپاہیوں کے پہرے میں لا کر ڈائس کے ایک طرف کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اس کے پاؤں میں وزنی بیڑیاں ہیں۔ پس منظر میں صلیب کا نشان پانچ بجے کا سائرن بجتا ہے۔ شور وغل ایک دم بند ہو جاتا ہے۔ ناظمِ اعلیٰ کرسی سے اٹھ کر لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے۔)

ناظمِ اعلیٰ: خواتین وحضرات! آپ کو یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ عمرِ دوام کا راز تلاش کر کے ڈاکٹر ینگ نے انسانیت کے خلاف ایک سنگین ترین جُرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس سے رائے عامہ اس قدر مشتعل ہو گئی کہ اس کے احترام میں حکومت نے ڈاکٹر ینگ کو عوامی عدالت کے روبرو پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ اس انتہائی قابلِ مذمت اور شدید جُرم کے لئے مُجرم کو کون سی سزا دی جائے تاکہ اُس جیسے دوسرے بے راہروؤں کو عبرت حاصل ہو۔ لیکن پیشتر اس کے کہ آپ اپنا فیصلہ صادر فرمائیں اور اس پر عمل درآمد ہو، میں آپ کی طرف سے ڈاکٹر ینگ کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ اپنے گناہِ عظیم کا اقبال کر کے اپنی روح کے بار کو ہلکا کر لے۔

آوازیں: ڈاکٹر ینگ کو پھانسی دو۔ ڈاکٹر ینگ مُردہ باد۔ ڈاکٹر ینگ کو پھانسی دو۔

ناظمِ اعلیٰ: اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو ڈاکٹر ینگ کو یقیناً پھانسی دی جائے گی۔ لیکن آئین اور قانون کے تقاضات کے پیشِ نظر مجرم کو صفائی کا موقع دینا لازمی ہے۔ آپ سے

درخواست ہے کہ ذرا ضبط سے کام لیں (سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے) مجرم کو پیش کرو۔

(سپاہی ڈاکٹر ینگ کو بازوؤں سے پکڑ کر مائیکروفون کے پاس لے آتے ہیں)۔

ڈاکٹر ینگ: (پر اطمینان لہجے میں) محترم عوام! مجھے اس بات کا مکمّل اعتراف ہے کہ میں نے آپ کے خلاف ایک شدید جُرم کا ارتکاب کیا اور اس کے لئے آپ مجھے جو بھی سزا دیں کم ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں میری کچھ مجبوریاں تھیں۔

.... مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میری ساری زندگی ایک خاص مقصد کے لئے وقف رہی اور وہ مقصد تھا موت پر قابُو پانا۔ مجھے اس راز کی تلاش تھی جسے پا کر انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہ سکے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اپنی نئی ایجاد کے ذریعے میں نے وہ راز تلاش کرلیا ہے اب جبکہ میری زندگی کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ میں اپنی ایجاد آپ کو سونپ کر آپ سے رُخصت لیتا ہوں۔

دوستو! مجھے نہ اُس موت کا کوئی خوف ہے جسے میں زیر کر چکا نہ اِس بات کا رنج کہ میرے آخری لمحات میں آپ میرے خون کے پیاسے بن گئے۔ یقین مانئے میں نے اس بات کو اپنی سعادت اور آپ کی خوش قسمتی سمجھا کہ آپ میں حق بات کہنے اور آزادانہ ڈھنگ سے سوچنے کا شعور ابھی باقی ہے۔ ورنہ اس دور میں جبکہ ہر چیز پر بے روح یکسانیت اور تاجرانہ ذہنیت کی چھاپ لگ چکی ہے، ذہنی آزادی کا تصوّر بھی ناممکن ہے مجھے حیرانی ہے تو اس بات پر کہ آپ نے اتنی مدّت تک میرا وجود کیسے برداشت کیا۔ مجھے انسان کے 'محسنِ اعظم' اور 'مستقبل کا معبود' جیسے القاب سے نوازا۔ لیکن شکر ہے کہ کم از کم میری موت سے پہلے آپ کو کسی قسم کی غلط فہمی نہ رہی اور آپ نے میری گرفتاری کا مطالبہ کیا۔ میرے تجربات پر پابندی لگانے کی مانگ کی اور میری ہلاکت کے منصوبے بنائے۔

محترم انسانو! میں یہ سب کچھ آپ کے دِلوں کو پگھلانے یا ارزاں شہرت حاصل کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا۔ میں فی الحقیقت اس بات پر نادم ہوں کہ انسان جب اپنی بقا کے واسطے موت کے لئے سرگرداں تھا تو میں نے نہ صرف اس کا ساتھ نہ دیا

بلکہ اس کے جذبات اور احساسات کے عین اُلٹ کام کیا۔ اگر چہ ایسا کرنے میں میری ایک زبردست مجبوری تھی...... یعنی میری زندگی کا مقصد۔ اب جب کہ میرا مقصد پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور میں اپنی ایجاد...... اچھی یا بُری جیسی بھی یہ ہے...... آپ کے حوالے کر چکا ہوں تو میری ایک ہی خواہش باقی رہ جاتی ہے، اگر یہ خواہش پوری ہو جائے تو اُس جُرمِ عظیم کا کسی حد تک کفارہ ہو سکتا ہے جو میں نے ابنِ آدم کے خلاف، آپ سب کے خلاف کیا۔ اپنی گزشتہ خدمات کے بوتے پر کیا میں یہ اُمید رکھوں کہ آپ میری آخری خواہش کو پورا کریں گے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ یہ خواہش آپ کی خواہشات کے عین مطابق ہو...........

آوازیں: ضرور۔ بالضرور۔

.... مجھے یہی توقع تھی۔ مہربان دوستو! گزشتہ ہزاروں صدیوں سے موت انسان کا سب سے بڑا خوف اور سب سے بڑا مسئلہ رہی ہے۔ اس پر فتح حاصل کرنے کے لئے انسان لاکھوں برس سے لگاتار سرگرم عمل رہا۔ عین اس وقت جب کہ موت پر انسانی فتح یقینی نظر آ رہی تھی، تو انسانیت ایک اور مسئلے سے دوچار ہوگئی۔ یہ مسئلہ پہلے سے بھی زیادہ شدید اور تشویشناک تھا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ مسئلہ تھا زندگی کے دوام کا۔ میری ایجاد نے درحقیقت آپ کے اس مسئلے کو بہت زیادہ پیچیدہ بنا دیا اگر چہ اس مسئلے کا حل انتہائی مشکل ہے لیکن آپ چاہیں تو نکل ضرور سکتا ہے۔ اگر اجازت ہو تو وہ حل پیش کروں۔

آوازیں: ضرور بالضرور۔

.... میرے کرم فرماؤ حل جتنا آسان ہے، اتنا مشکل بھی۔ اگر آپ چاہیں تو قابلِ عمل ہو سکتا ہے اور اگر آپ نہ چاہیں تو بے سود۔ بہر حال میں آپ کو اور زیادہ منتظر نہیں رکھوں گا۔ تو لیجئے میرا حل یہ ہے کہ ہم سب انسانی عمر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر لیں اس سے زیادہ عمر کے لوگوں کے لئے موت لازمی قرار دے دی جائے اگر آپ چاہیں تو یہ حد ایسی ہو سکتی ہے جس سے آپ کا مسئلہ مزید پیچیدہ نہ ہو، میرا مطلب ہے ۱۲۰ برس، ۱۳۰ برس یا جتنی آپ چاہیں۔ اگر آپ کو میرا مشورہ قابلِ قبول

ہوتو میں یہ حد ۱۵۰ برس تجویز کروں گا کیوں کہ انسان کی موجودہ اوسط عمر یہی ہے اور یہاں سے ہی مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہونا شروع ہوا تھا۔ کہیے منظور ہے یہ حد؟

مسٹر لابی کی رہنمائی میں مجمعے کے ایک بڑے حصّے سے آوازیں: نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہم ابھی مرنا نہیں چاہتے۔ ہم ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ہمیں عمر دوام چاہیے۔

ڈاکٹر ینگ: آپ ضرور زندہ رہیں لیکن میں اپنی جاں بخشی کی درخواست کر کے اپنے دامن پر ذلالت کا مزید سیاہ دھبہ نہیں لگوانا چاہتا۔ میرا گزشتہ جرم ہی کافی سنگین ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جلدی سے جلدی اس کا کفارہ کرلوں آپ عمر دوام چاہتے ہیں تو میری نئی ایجاد آپ کو مبارک ہو (صلیب کی طرف مُنہ کر کے) جلاّدوں کو حکم دیں کہ مجھے سُولی پر لٹکا دیں! اچھا خدا حافظ۔

تمام مجمع سے آوازیں: نہیں، نہیں۔ ڈاکٹر ینگ زندہ رہیں گے۔ ڈاکٹر ینگ زندہ باد۔ ڈاکٹر ینگ ہمارا نجات دہندہ ہے۔ ڈاکٹر ینگ کو چھوڑ دو۔

(عوام کے تیور دیکھ کر ناظمِ اعلیٰ سپاہیوں کو اشارہ کرتا ہے اور وہ اس کی زنجیریں کھول دیتے ہیں)۔

ناظمِ اعلیٰ: (عوام کو مخاطب کرتے ہوئے) آپ کے فیصلے سے ڈاکٹر ینگ کو نہ صرف باعزّت رہا کیا جاتا ہے بلکہ آپ کی خواہش کے مطابق اُنہیں 'حقیقی خُدا' کا لقب بھی دیا جاتا ہے۔

آوازیں: حقیقی خُدا زندہ باد۔ محسن اعظم زندہ باد۔ ڈاکٹر ینگ زندہ باد۔

ڈاکٹر ینگ: (عوام کو مخاطب کرتے ہوئے) عظیم ساتھیوں! میں آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ درحقیقت آپ سب میری خُدائی عظمت میں برابر کے حصّے دار ہیں۔ لیکن دوستو! ہم سب کو فی الحقیقت ایک عظیم مسئلہ درپیش ہے، میری خواہش ہے کہ آپ اس مسئلے سے اس حقیقت سے آنکھیں بند نہ کریں۔ اس لئے میں بار بار آپ کو آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں تھوڑی دیر ہوئی میں نے جو حل پیش کیا تھا، وہ آپ کو قابلِ قبول نہیں۔ اب میرے پاس ایک ہی حل رہ گیا ہے۔

آوازیں: حقیقی خُدا زندہ باد۔ محسنِ اعظم زندہ باد۔ حقیقی خدا زندہ باد۔

ڈاکٹر رینگ: ارض وسما کے تاجدارو! مسئلہ انتہائی نازک ہے اور آپ سب کی تمام تر توجہ کا مستحق۔
آپ کے حقیقی خدا کو جو آخری حل نظر آیا وہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی زندگی کو ایک بنیادی مقصد...... ایک ارفع و اعلیٰ مقصد قرار دے لے اور جب اس مقصد کی تکمیل ہو جائے تو وہ رضا کارانہ طور پر زندگی سے دستکش ہو جائے۔ بولو منظور ہے یہ حل یہ آپ کی اور انسانیت کی آخری اُمید ہے۔ (مجمع پر سناٹا چھا جاتا ہے۔ پھر ایک ساتھ بہت سی آوازیں: نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ہمیں عمر دوام چاہئے۔ ڈاکٹر رینگ پاگل ہے۔ بڈھے کا دماغ چل گیا ہے۔ پاگل کو مار دو۔ پاگل کو ہلاک کر دو۔)
(ناظم اعلیٰ سپاہیوں کو اشارہ کرتا ہے، سپاہی ڈاکٹر رینگ کو بیڑیاں پہنانے کے لئے آگے بڑھتے ہیں)۔

ناظم اعلیٰ: (عوام کو مخاطب کرتے ہوئے) عوامی فیصلے کے مطابق، پاگل ڈاکٹر رینگ کو پھانسی کی سزا کا حکم سُنایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر رینگ: (آواز اُونچی اور باوقار ہے مگر دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے[1]) عقل مند انسانو! پیشتر اس کے کہ آپ اپنے حقیقی خُدا کو ہلاک کرنے کی تکلیف کریں، آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ وہ اس دنیا سے کب کا رخصت ہو چکا۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے فوراً ہی بعد اس کی موت ہو گئی تھی، لیکن اپنی دوسری ایجاد کے ذریعے موت کے ۲۴ گھنٹے بعد تک وہ زندہ رہا تا کہ آپ کے سامنے اپنے جرم کا اقبال کر کے............ ہا۔ ہا۔ ہا............ اپنی روح کے بار کو ہلکا کر سکے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔...... عمر دوام کے پرستارو! زندہ رہو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہو۔ ہا ہا ہا۔ تم اسی سزا کے مستحق ہو۔
(ڈاکٹر رینگ مُردہ حالت میں زمین پر گر پڑتا ہے۔ ساتھ ہی پردہ نیچے آتا ہے۔)

ختم شد

●●●

---

1. اس تکنیک کو انگریزی میں (Ventriloquy) کہتے ہیں۔

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

M/o HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India

اہلِ وطن کو 58 واں یومِ آزادی مبارک

قومی اردو کونسل کی کارگزاریوں کی ایک جھلک

''متحدہ ترقی پسند محاذ آئین کی دفعہ 345 اور 347 کے تحت اردو زبان کی حیثیت کو تسلیم کرنے اور اسے فروغ دینے کی کوشش کرے گا۔''

کم از کم مشترکہ پروگرام

حکومت اردو زبان اور تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں ہے اور اس سمت میں کارگر کوششیں جاری ہیں۔ وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے 3 اور 4 جولائی 2004 کو وگیان بھون، نئی دہلی میں ''اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم'' کے موضوع پر منعقدہ قومی کانفرنس کے افتتاح کے موقعے پر اردو کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں حکومت کے موقف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم اردو کے فروغ کے لیے پابند عہد ہیں۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جس سے مجھے ذاتی لگاؤ ہے۔''

اس تاریخی کانفرنس میں مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے یقین دہانی کرائی کہ حکومت اردو کے فروغ کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کرے گی۔ کانفرنس میں اردو زبان و تعلیم کی ترقی کے لیے درج ذیل تجاویز پیش کی گئیں۔

1. قومی اردو کونسل نے اردو زبان کو انفارمیشن ٹیکنالوجی سے جوڑ کر اردو داں طبقے کو روزگار مرکوز تربیت دینے میں جو کامیابی حاصل کی ہے اسے پورے ملک میں مزید وسعت دی جائے۔
2. ملک کے تمام اسکولوں بشمول نوودے ودیالیہ اور کیندریہ ودیالیہ میں اردو تعلیم کا نظم کیا جائے۔
3. آئین کی دفعہ (A)350 کی روشنی میں تمام طبقوں کے طلبہ و طالبات کی ابتدائی تعلیم کا ذریعہ مادری زبان کو بنایا جائے۔
4. قومی اردو کونسل کو اردو کی تمام درسی کتابوں کی تیاری اور تقسیم کی ذمے داری دی جائے۔
5. اردو میڈیم اسکولوں کا تعلیمی معیار بلند کرنے کی کوشش کی جائے۔

قومی اردو کونسل وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند کے ماتحت فروغ اردو کی کوششوں میں مصروف ہے اور اس کے لیے مختلف اسکیموں اور پروگراموں پر عمل درآمد جاری ہے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی : ایک سالہ ''ڈپلوما ان کمپیوٹر ایپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگول (ڈی۔ ٹی۔ پی۔)'' کورس 1999 سے ملک گیر سطح پر جاری ہے جس کے 226 مراکز 22 صوبوں کے 107 ضلعوں میں نئی اردو داں نسل کے تقریباً 13820 طالب علم جن میں 6267 لڑکے اور 7553 لڑکیوں کو سالانہ تربیت فراہم کر رہے ہیں اس میں 50 سینٹر صرف خواتین کے لیے سواشکتی (نورڈ) اسکیم کے ہیں۔ اب تک 16397 طالب علموں 8703 لڑکے اور 7694 لڑکیوں کو ڈپلوما دیا جا چکا ہے جن میں سے 60 فیصد سے زیادہ طلبہ برسر روزگار ہیں۔ اس کورس کا مقصد اردو داں طبقے کو نئے ٹیکنالوجیکل منظر نامے کا حصہ بنانا اور روزگار کے مواقع فراہم کرنا ہے۔

کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن سینٹر : قومی اردو کونسل ملک کے مختلف حصوں میں خطاطی اور گرافک ڈیزائن کے دو سالہ کورس کے 23 مراکز چلا رہی ہے۔ دسویں پانچ سالہ منصوبے کے تحت مراکز کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا۔ ان مراکز کے قیام کا مقصد اردو طباعت کی متعلق ضرورتوں کی تکمیل اور اردو کے اس فن کا تحفظ ہے۔

اشاعتی سرگرمیاں : قومی اردو کونسل حکومتِ ہند کا واحد اردو اشاعتی ادارہ ہے۔ کونسل کی اشاعتی سرگرمیوں کے تحت بچوں کے ادب اور اردو ذریعۂ تعلیم کی نصابی کتابوں پر خاص توجہ دی جارہی ہے۔ اشاعتی منصوبوں میں اردو زبان کے کلاسیکی ادب کی اشاعت کے علاوہ لغات، انسائیکلوپیڈیا، حوالہ جاتی کتابیں اور دنیا کی کلاسک اور ٹیکنالوجی اور انسانی علوم کی تمام شاخوں سے متعلق کتابیں اردو میں منظر عام پر لائی جارہی ہیں۔ کونسل اب تک 1000 سے زائد کتابیں شائع کر چکی ہے۔

بچوں کا ادب : مستقبل کے اثاثے یعنی بچوں کی مناسب تعلیم و تربیت کے پیش نظر کونسل نے 287 سے زیادہ سبق آموز اور معلوماتی کتابیں شائع کی ہیں جن میں چلڈرن بک ٹرسٹ کی تیار کردہ 125 کتابوں کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ کتابیں خوبصورت رنگین تصاویر سے مزین ہیں۔

رسائل و جرائد : قومی اردو کونسل اردو خبروں اور نظریات و خیالات پر مشتمل ماہنامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی علمی مجلہ ''فکر و تحقیق'' گذشتہ سات سال سے مسلسل شائع کر رہی ہے۔ اردو خبروں، حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں معلومات، تجزیاتی اور معلوماتی مضامین کی وجہ سے ''اردو دنیا'' کی اردو حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی ہو رہی ہے۔ ''فکر و تحقیق'' اپنے اعلا تحقیقی مضامین کی بنا پر پسند کیا جاتا ہے۔ قومی اردو کونسل نے اردو رسم خط سے نابلد حضرات کو اردو شعر و ادب اور زبان سے متعلق معلومات سے واقف کرانے کے لیے حال ہی میں دیوناگری لپی میں سہ ماہی ''اردو درپن'' کی اشاعت شروع کی ہے جسے قارئین بیحد پسند کر رہے ہیں۔

کل ہند اردو کتاب میلے اور کتابوں کی فروخت: قومی اردو کونسل دلی میں دو، ممبئی میں دو اور سری نگر میں ایک کل ہند اردو کتاب میلہ منعقد کر چکی ہے جن میں ہندوستان بھر کے اردو ناشرین نے شرکت کی۔ اپنی مطبوعات کو وسیع تر عوامی حلقوں تک پہنچانے کے لیے کونسل ملک کے مختلف حصوں میں منعقد ہونے والے قومی کتاب میلوں میں شرکت کرتی ہے جہاں کونسل کی مطبوعات بڑی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ گذشتہ آٹھ سال میں ایک کروڑ 25 لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔

گوپی چند نارنگ

دی وار جرنلس
ایک اگلا قدم

تخلیقی معاشرہ ہمیشہ کسی ایسے لمحے کا منتظر رہتا ہے جب اچانک کوئی تخلیق طویل عرصے پر پھیلے ہوئے اندھیروں اور خاموشی کو روندتی ہوئی افکار اور اجتماعی لاشعور کی گم شدہ حقیقتوں کے تانے بانے کو کسی نئے تخلیقی احساس کے ساتھ ہم پر منکشف کرتی ہے۔ میں گذشتہ کئی برسوں سے اردو ناول میں کسی نئے لمحے کی آمد کا شدت سے منتظر ہوں۔ اچانک صلاح الدین پرویز نے اپنے ناول 'دی وار جرنلس' کا مسودہ مجھے لاکر دیا اور اس کے مطالعے سے میں ایک تازہ کار تجربے سے ہم کنار ہوا۔ صلاح الدین پرویز نے اب سے پہلے بہت سی نثری اور شعری تخلیقات کے ذریعہ اپنے جنوں خیز عشق کی کیفیات کو ادب کے قالب میں ڈھالا اور وہ سب کتابیں اپنی انفرادیت کے ساتھ اپنا تخلیقی وجود رکھتی ہیں۔ زیرنظر تخلیق 'دی وار جرنلس' ناول کی دنیا میں اکیسویں صدی کا پہلا مژدہ ہے۔ کچھ عرصہ قبل سے میں اردو ادب کو جن نئے فکری محرکات اور ڈسکورس کا محور بنانا چاہتا ہوں، اس کے بہت سے نشانات اس میں ہیں۔

صلاح الدین پرویز ایک زندہ ادیب ہیں، وہ مابعد جدید عہد میں سانس لے رہے ہیں، مابعد جدید تصورات پر برابر غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر 'استعارہ' میں بہت سی تحریریں شائع کی ہیں جن میں خود ان کی تحریروں کے علاوہ دوسرے اہم ناقدین کے مضامین بھی شامل ہیں۔ میں نے اردو میں مابعد جدید تصور کی تشکیل کے دوران جب جدیدیت کے نمٹ چکنے کا نکتہ اٹھایا، تب میرے ذہن میں بہت سے سوالات تھے۔ مثلاً یہ کہ ترقی پسند تحریک کی تردید کے لیے شروع ہونے والا جدیدیت کا پروجیکٹ اگرچہ باغیانہ عزائم

رکھتا تھا لیکن رفتہ رفتہ فقط ہیئت پرستی کا شکار ہو کر ادب اور تخلیق کے بعض بنیادی تصورات کو رد کرنے اور ایک نئی طرح کی فارمولائی اور ہیئتی لیک دینے میں سرگرم ہو گیا۔ ایک ضد یہ قائم کر دی گئی کہ سماجی سروکار سے ادب بے تعلق ہو جائے جب کہ تخلیقی احساس کی بنیادی شرط، سماجی سروکار، تاریخ کے قدیم تصور سے رہائی اور روایتوں کی تجدید ایک بڑا ادبی مطالعہ ہے۔ صلاح الدین نے اگرچہ جدیدیت کے نقطۂ عروج کے دور میں آنکھ کھولی تھی لیکن وہ رفتہ رفتہ اس تصور سے آگے نکل جانے کے لیے بے قرار نظر آئے اور اس بے قراری، جوش اور جنون کا نتیجہ ان کا وہ تخلیقی سفر ہے جو آج انھیں 'دی وار جرنلس' تک لے آیا ہے۔

صلاح الدین پرویز کا ناول موجودہ عالمی معاشرے کے Crisis میں گم شدہ مہابیانیوں کے وسیلے سے اپنے عہد کے ضمیر کی بازیافت میں مصروف ہے۔ آج کے پر درد منظر نامے پر جب موت ارزاں اور انسان گراں ہے، یہ تخلیقی آتما کی اتھاہ پیڑا اور کراہ کا استعارہ ہے۔

ناول کا پہلا حصہ عراق اور گجرات کے واقعات کے تناظر میں اس عہد کی ان تمام دہشت گردانہ چیرہ دستیوں کی جانب نگراں ہے جو عالمی سطح پر صداقت، جبر اور دہشت کے علامیوں کی تفصیل سمیٹے ہوئے ہے۔ صلاح الدین پرویز کا ذہن بیک وقت اپنی مختلف تخلیقات کے ساتھ Crisis کے اس منظر نامے میں انسان اور آدمی اور تہذیب کے ان بنیادی حقائق کی کھوج میں مصروف نظر آتا ہے جن کا ڈسکورس بہت سے مفکرین اور بے شمار کتابوں تک پھیلا ہوا ہے۔ تخلیق میں اور خاص طور پر نثری تخلیق میں صلاح الدین نے جس طرح نثر اور نظم کے امتزاج سے فن کارانہ اسمبلا ژ بنانے کی کوشش کی ہے، اس کی مثالیں اردو میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

یہ عہد، میڈیا کی یلغار کا ہے۔ ہم کسی بھی عالمی معاملے میں کسی فریق کو مکمل طور پر ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ تاہم ذمہ داری سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ہمیں یہ خیال ضرور رہتا ہے کہ دنیا کا سماجی اور سیاسی منظر نامہ بدلتا بھی رہتا ہے اور اس میں تواتر کا عنصر بھی باقی رہتا ہے۔ مثلاً ن۔م۔ راشد نے چھٹی دہائی میں بغدا کے مشاہدات کو اور عراق کی سیاسی صورت حال کو اور مشرقِ وسطیٰ میں پیدا ہوتے ہوئے سراسیمگی کے ماحول کو اپنی سلسلہ وار نظموں میں حسن کوزہ گر کے نام سے پیش کیا تھا۔ صلاح الدین پرویز کے ذہن

میں ایک بین المتونی 'Intertextual' احساس مضطرب ہے، انہوں نے آج کے عراق کو میڈیا اور اپنے ذہن کی نظر سے دیکھتے ہوئے راشد کی نظموں کو Deconstruct کیا ہے اور حسن کوزہ گر، جہاں زاد اور یوسف عطار کے Subtext ابھار کر وہ نئی معنویت تلاش کی ہے جس کا تعلق موجودہ عہد کی تاریخ سے ہے۔ یہ نظمیں جس طرح 'دی وار جرنلس' میں پیوست ہوئی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ صلاح الدین اپنی تخلیقی اپج کے مطابق تخلیقی سفر ذہن کی ایک جست میں طے کر لیتے ہیں۔ وہ جس جہان کو لیتے ہیں، اس میں کئی زمانے شامل رہتے ہیں، نئے اور پرانے کی تفریق مٹ جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ صلاح الدین سطحی یکسانیت کے نہیں بلکہ معنی کی تکثیریت کے تخلیق کار ہیں اور یہ رویہ مابعد جدید تخلیق کا وہ جشن جاریہ ہے جسے میں بہت پہلے اس طرح خوش آمدید کہہ چکا ہوں:

''مابعد جدیدیت ہر طرح کی کلیت پسندی کے خلاف ہے، اس لیے کہ کلیت پسندی، آمریت، یکسانیت اور ہم نظمی کا دوسرا نام ہے اور یکسانیت اور ہم نظمی تخلیقیت کے دشمن ہیں۔ تخلیقیت غیر یکساں، غیر منظم اور بے محابا ہوتی ہے۔ یہ Libido خواہش نفسانی کا نشاط انگیز اظہار ہے۔

تخلیقیت کا تعلق کھلی ڈلی آزادانہ فضا سے ہے، یہ عبارت ہے خود روی اور طبعی آمد (Spontaneity) سے۔ تخلیقیت کو میکانکی کلیت کا اسیر کرنا اس کی فطرت کا خون کرنا ہے۔ کلیت پسندی کے مقابلے پر مابعد جدید فکر، تفرق آشنائی کو موجودہ عہد کا مزاج قرار دیتی ہے۔ مرکزیت کا تصور اسی لیے ناپسندیدہ ہے کہ کلیت کا پیدا کردہ ہے۔ تخلیقیت مائل بہ مرکز نہیں، مرکز گریز قوت رکھتی ہے۔ تخلیقیت آزادی کی زبان بولتی ہے جب کہ کلیت محکومیت پیدا کرتی ہے، لیک پر چلاتی ہے، فکر پر پہرہ بٹھاتی ہے اور معنی کی راہ بند کرتی ہے۔ پس ساختیاتی فکر کی رو سے آرٹ کی خودمختاری مشکوک اسی لیے ہے کہ جب معنی کا مرکز نہیں تو کثیر المعنویت پر پہرہ کیوں کر بٹھایا جا سکتا ہے۔ نیز معنی کے تفاعل میں جوں ہی قاری (یا سامع یا ناظر) داخل ہو جاتا ہے، آرٹ کی خود مختاری ساقط ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ فقط قاری متن کو نہیں پڑھتا بلکہ متن بھی قاری کو پڑھتا ہے۔ مصنف معنی کا حکم یا

آمر نہیں کیوں کہ معنی قرأت کی سرگرمی اور قاری کے تفاعل کا نتیجہ ہے اور ہر متن بدلتی ہوئی ثقافتی توقعات کے محور پر پڑھا جاتا ہے۔ معنی خیزی کا لامتناہی ہونا تخلیقیت ہی کی شکل ہے۔ لہٰذا اکثیر المعنویت، بھرپور تخلیقیت، رنگارنگی، بوقلمونی، غیر یکسانیت اور مقامیت بمقابلہ کلیت پسندی و آمریت، مابعد جدیدیت کے نمایاں خصائص ہیں۔ ادورنو نے اس بات کو بہت پہلے محسوس کرلیا تھا کہ آواں گارد ہی موجودہ مزاج کی صحیح ترجمانی کرتا ہے کیوں کہ وہ معنی وحدانی کے خلاف ہے۔''

اب یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ صلاح الدین کا ذہن ایک آواں گارد تخلیقی ذہن ہے۔ یہ ذہن ہر قسم کی کلیت کو رد کرتا ہے۔ متن کے آزادانہ وجود اور قاری کی مسلسل تخلیقی تفہیم کو خوش آمدید کہتا ہے۔ یہ ذہن کسی تخلیق کو تقویم کے دائروں میں قید نہیں ہونے دیتا، اس کی تفہیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یہی تخلیق کا جشن جاریہ ہے۔

صلاح الدین پرویز نے ہمارے عہد کو تخلیقی ڈسکورس کا ایک نیا محاورہ عطا کیا ہے۔ اس ناول میں صلاح الدین کی وہ تمام نظمیں شامل ہیں جو موجودہ عرصے میں آج کے درد کے دباؤ میں تخلیق ہوئی ہیں۔ وہ نئے نثری پیمانے بھی ہیں جو فکشن کی ایک نئی اور آزادانہ کائنات کی تصویر بن سکتے ہیں۔ اس ناول میں عہد نو کا وہ نیا تصور بھی ہے جو تخلیق کو ہر طرح کی نظریاتی جکڑن سے ماوراء کرتا ہے اور تخلیق کار پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے تجربے کو خود اپنے اقداری نظام میں وضع کرے، انسانیت اور سماج کو جواب دہ ہو اور آج کے قاری اور آنے والے زمانے کے قاری کو شامل کرتا رہے۔

یہ یقینی طور پر مابعد جدید ذہن کا اظہار ہے جو ہر طرح کی کلیت پسندی، ادعائیت اور عمومیت زدگی کے خلاف ہے اور اس کے مقابلے پر مخصوص اور مقامی نیز کھلے ڈلے فکری بے محابا اور آزادانہ اظہار پر اصرار کرتا ہے۔

'دی وار جرنلس' دراصل صلاح الدین پرویز کے اس تخلیقی لاشعور کا آئینہ ہے جو مشرقیت کے آزادانہ تہذیبی تشخص اور اس کی لہولہان پہچان پر اصرار کرتا ہے۔ جس میں 'نمرتا' سے لے کر راشد کی 'جہاں زاد' اور موجودہ عہد کے صدام حسین، بش اور ٹونی بلیئر جیسے کردار شامل ہیں۔ یہ کردار مخصوص ناموں سے وابستہ اپنی شناخت ہی نہیں بلکہ بیک

وقت لامحدود عالمی منظرنامے کی تہذیبی کشاکش کے استعارے بھی ہیں۔ جن سے آگاہ ہوکر اب ہم نہ صرف اپنے عہد کی بلکہ قدیم زمانوں تک پھیلی ہوئی انسانی سوچ اور آرکی ٹائپ کے روبرو ہوسکتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ صلاح الدین کا ذہن حد درجہ خلاقیت، عشق اور جوش کا حامل ہے۔ وہ زندگی کے گہرے سمندروں کی پیمائش کرتا ہے۔ ہیرے جواہرات بھی تلاش کرتا ہے اور دکھ درد اور پیڑا کی طویل داستانوں کی تھاہ بھی لیتا ہے۔ جن سے انسان کے ماضی کی تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ جیمس جوائس نے اپنے ناولوں کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جملہ لکھا تھا کہ:

''میں اپنے ذہن کی بھٹی میں اپنے عہد کے انسانی ضمیر کو پگھلا رہا ہوں۔''

یہ مختصر سا جملہ صرف جیمس جوائس کی شدت کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ہر دور کا سچا فن کار، آتش و آہن کے اس غضبناک کھیل میں ہمیشہ سرگرم رہتا ہے اور اس فولاد کو پگھلانے کی کوشش کرتا ہے جس میں انسانی ضمیر کی بنیادی ساخت کا کچا لوہا محفوظ ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ۱۹۵۰ء کے بعد دنیا میں جن ناولوں کا بہت ذکر ہوتا رہا، ان میں ولیم باروز کا ناول Reshuffle بھی شامل ہے۔ باروز نے یہ کوشش کی تھی کہ ناول کے ہر صفحے کو تاش کا ایک پتا بنایا جائے اور تاش کے پتوں کی طرح جب بھی کوئی کھلاڑی یا کوئی قاری ان صفحات کو reshuffle کرے تو اس قاری کو ایک تسلسل اور انفرادی تکمیل کا احساس ہو۔

'دی وار جرنلس' میں صلاح الدین پرویز کی تحریر کی ساخت کچھ اس طرح ہے کہ ہم عراق، افغانستان، گجرات اور دوسرے المناک سلسلوں کو اور مہابھارت کے اٹھارہ دنوں کے یدھ کے معنیاتی جزر و مد کو اگر reshuffle بھی کریں تب بھی ان میں تہہ نشیں انسانی پیڑا اور کراہ کا تسلسل قائم رہے گا اور صلاح الدین کی نظموں کے جو ٹکڑے اس ناول میں شامل ہیں، ہمیشہ ایک ایسے ناگزیر رابطے کا سبب بنے رہیں گے جن میں روشنی بھی ہوگی اور گرمی بھی۔ اور ہمیں یاد آتا رہے گا کہ نثر اور نظم کے رشتوں کی منطق کو تلاش کرنے والی کتاب The Mirror and the Lamp جس سے ہمارے عہد

کے بعض ہیئتی احباب نے استفادہ کیا تھا، اس کے کچھ حقائق صلاح الدین پرویز کے ناول کی اور ناول کے تار و پود اور ساخت کی بنیاد بن گئے ہیں۔

ساخت کی ترکیب استعمال کرتے ہوئے میرے ذہن میں معا ردتشکیل کا تصور بھی ابھرتا ہے۔ ردتشکیل دراصل ایک شدید باغیانہ روش ہے اور اس کے طریقہ کار یا موقف کو خیالات کے ایک محکم نظام کے طور پر پیش کرنا نہ صرف غلط فہمی کا شکار ہونا بلکہ حقائق کو غیر معمولی طور پر سادہ بنا دینے کے مترادف ہے۔ صلاح الدین نے زیر نظر ناول میں عصری بصیرتوں کے بعض گہرے سوالات کو سادہ انداز میں پیش کرنے کے بجائے ردتشکیل کو اختیار کیا ہے۔ ان کے ناول میں پرانی ساختوں کی شکست پر نئی ہیئتیں وضع کی گئی ہیں اور برسوں سے قائم تصورات اور پرانے مفاہیم کو رد کرتے ہوئے آزادانہ متن کی تشکیل کو بروئے کار لایا گیا ہے جو متعینہ معنی سے گریز کرتے ہوئے معنی کی نئی طرفوں کو کھولتا ہے۔ زیر نظر ناول میں بیک وقت ورلڈ ٹریڈ ٹاور کی ہیبت ناک تباہی بھی ہے، افغانستان کے مجبور اور لاچار بچوں کی صورت حال بھی، گجرات کی ہولناک تباہی بھی اور اس عراق کی شکست و ریخت بھی جو صدیوں سے اسطور اور گمشدہ تہذیبوں کا محور بنا رہا ہے۔ یہ تحریر زماں و مکاں کا بے حد جنوں خیز تصور پیش کرتی ہے۔ اس میں اساطیر کا واہمہ نہیں ہے، نہ داستانوں کی چاشنی ہے۔ بلکہ یکسر ایک الگ تخلیقی رویہ ہے۔ جو نہ صرف تخلیق کی پرانی روش سے ہٹ کر ہے۔ بلکہ اب سے پہلے کی تنقید کے اس رویے کو بھی رد کرتا ہے کہ کوئی بھی تخلیق ایک نامیاتی کل ہوتی ہے اور Organic Whole کے تصور کو رد کرنے والی یہ تحریر ایک خیال افروز مابعد جدید تخلیقی رویے کا حامل ہونے کے اعتبار سے برابر اپنی پرتوں کو کھولنے کی دعوت دیتی رہے گی۔

مصنف نے مہابھارت سے لے کر عراق کی جنگ تک کئی واقعات کو کسی حتمی فیصلے کی منزل تک پہنچانے کے بجائے قاری کے لیے بہت سے زاویے کھلے چھوڑ دیے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا قاری پر ہے کہ وہ ان واقعات اور ناول کے مندرجات کو کس طرح انگیز کرتا ہے۔

کچھ دہائیوں سے فکشن میں ہیرو اور اینٹی ہیرو کی بحث بہت شدت سے بپا رہی ہے

تاہم صلاح الدین، اپنی اس تخلیق میں ان تمام مباحث سے بہت الگ ہیں۔ ان کے ناول میں یدھشٹر سے کافکا تک اور صدام حسین سے بش تک جتنے کردار ہیں، وہ سب اپنی اپنی جگہ ہیرو یا اینٹی ہیرو سے ہٹ کر ہیں۔ ان میں کوئی رابطہ ہو یا نہ ہو، لیکن اجتماعی لاشعور کے سرچشموں میں یہ تمام اعلام، اپنے اپنے زمانوں اور اپنی اپنی حیثیتوں میں mytheme کا درجہ رکھتے ہیں۔ کیا یہ تمام کردار اور واقعات جن کے سلسلے میں کوئی فارمولائی رویہ اختیار نہیں کیا گیا ہے، یہ محض بوسیدہ اور پژمردہ استعارے ہیں؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے کہ تخلیق میں جو بھی کھٹراگ ہوتا ہے، اس کی معنویت اور موقع مفہوم کی تشکیل اور عدم تشکیل میں کارگر ہوتے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ گذشتہ دہائیوں میں ہیئتی تنقید کے بعض علمبرداروں نے تخلیق میں موجود سروبرگ سے صرف نظر کرتے ہوئے اشکال اور لایعنیت پر توجہ مرکوز کی ہے۔ ایسے حضرات نے غالب سے تائید حاصل کرنے کے لیے اس شعر کا سہارا لیا:

نہیں گو سرو برگ ادراک معنی

تماشائے نیرنگ صورت سلامت

شاید ان دوستوں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ غالب تو اپنے اس شعر میں سرو برگ کے وجود اور اس کی اہمیت کو تسلیم کر رہا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جب تک ہم کسی منظرنامے کے معنیاتی جزر و مد سے واقف نہ ہوں، تب تک ہماری حیثیت محض ایک تماشائی کی ہوتی ہے اور ہم تفہیم کا حق ادا نہیں کر پاتے۔ صلاح الدین پرویز نے بھی جرنلس میں سروبرگ ادراک معنی کا تماشا قائم کرنے کی سعی کی ہے اور پڑھنے والے کے سامنے بہت سے سوالات رکھ دیے ہیں۔ یہ تمام سوالات وہ ہیں جو روایتی ہیئتی تنقید کے تصورات کا پول کھولتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہر تخلیق اثبات و نفی کے تصور در تصور کی حامل ہوتی ہے۔ تخلیق کار ایک جانب دانتے کو قبول کرتا ہے تو دوسری جانب اسے رد کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ وہ افغانستان اور عراق پر حملہ آوروں کی کاوشوں کو اثبات و نفی کے رد در رد سے دیکھتا ہے لیکن اثبات و نفی سے ماورا اس کا بنیادی تعلق انسانی دکھ درد، اندر کی پیڑا اور اس طرح یہ ٹریجڈی سے ہے جس کے جلو میں تاریخ کی حقیقتیں نئی سے پرانی اور پرانی سے نئی ہوتی رہتی ہیں۔

یورپ بالخصوص فرانس کے بعض اہم ادیبوں کا رویہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنی مختلف تخلیقات کے بنیادی امور روز مرہ زندگی کے سیاسی اور سماجی کارنامے، رفتگاں کی یادوں پر مشتمل نشانیات، مسلسل تحریر کرتے رہتے ہیں اور ایسی تحریروں کو انہوں نے 'جرنلس' کے نام سے شائع کرایا۔ مجھے خاص طور پر ژاں کا کتیو کے وہ جرنلس یاد آرہے ہیں جسے کا کتیو نے مشرقی ایشیا میں اپنا تھیٹر اسٹیج کرنے کے لیے گزارے ہوئے دنوں میں لکھا — ان جرنلس میں اس عہد کے مشرق وسطیٰ کی صورت حال بھی ہے، سیاسی اور سماجی رویے بھی اور کا کیتو کا وہ خلاق ذہن بھی جو واقعات اور حقائق کو اپنے فن کارانہ نقطۂ نظر سے پرکھ رہا تھا۔ اس سفر کے بعد جب ژاں کا کتیو واپس پیرس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ پیرس کے کافی ہاؤسز میں اس کے معاصر ادیب اور شاعر مشرق وسطیٰ یا دنیا کے دیگر ممالک کی صورت حال سے بے نیاز راں بو کے اس مجموعے کی اشاعت پر بحث میں مصروف تھے جو ان دنوں شائع ہوا تھا اور جس میں راں بو کی کچھ غیر مطبوعہ تخلیقات شامل تھیں۔ ایسے بہت سے جرنلس یورپی زبانوں میں لکھے جا چکے ہیں۔ اردو میں صلاح الدین نے پہلی بار اپنے تخلیقی احساس، اپنے خوف، اپنی تشویش، اپنے احساس جمال اور اپنے شعری Images کو تخلیقی طور پر recreate کر کے 'دی وار جرنلس' میں تخلیقی ہیئت اور ناول کے ایک نئے فورمیٹ کا تجربہ کیا ہے۔ یہ ایک بشارت بھی ہے اور ایک ایسے فن کار کے ذریعہ جو اپنی صبحوں، اپنی شاموں اور اپنی راتوں میں ہمیشہ تخلیق کی اذیت ناک کیفیتوں سے گزرتا رہتا ہے اور اپنی ہر تحریر اور ہر کتاب کو ادب کا نیا محور بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

مجھے صلاح الدین پرویز کی اس تحریر سے بے حد خوشی ہوئی اور اپنے پرانے الفاظ میں یہ بات دہرانا چاہتا ہوں کہ یہ ناول نیا بھی ہے اور ادب بھی، ادب کی پہلی شرط اس کا ادب ہونا ہے اور ادب وہی ہے جو زندگی کی حرکت و حرارت سے جڑا ہوا ہو۔ اپنی تہذیبی پہچان رکھتا ہو اور اپنے عہد کے ذہن و شعور، سوز و ساز، درد و داغ و جستجو و آرزو کی آواز ہو، یعنی ایسی آواز جو سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں اتر سکے۔

[بشکریہ استعارہ]